معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ : حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس. ایم. کالج. اسٹریچن روڈ. کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں. بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں ؛

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے. اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا.
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں.
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی.

کمیشن ۲۵٪ ہوگا. رقم پیشگی آنی چاہیے.

جلد ۱۶۳ ماہ ذی قعدہ ۱۴۱۹ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۹۹ء عدد ۳

فہرست مضامین

شذرات

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کے جانشین اور قرآنیات، حدیث، فقہ اور فلسفہ میں درک و بصیرت رکھنے والے مشہور عالم مولانا امین احسن اصلاحی کی علمی و دینی خدمات کے اعتراف میں ان کی وفات کے بعد پاکستان میں دو سمینار ہوئے لیکن ان کی تمام تر تعلیم مدرسۃ الاصلاح۔ سرائے میر میں ہوئی تھی، مدتوں تدریس کی خدمت بھی انجام دی، ماہنامہ الاصلاح جاری کیا، مولانا فراہی کی کتابوں کے اردو ترجمے کیے، حقیقت شرک اور حقیقت توحید جیسی بلند پایہ کتابیں لکھیں، اس بنا پر مدرسہ کا حق تھا کہ وہ اپنے اس محسن کی علمی قدردانی کا ثبوت دے، اس کی انجمن طلبۂ قدیم مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس نے ۲۴ تا ۲۶ فروری کو مولانا کی مادر علمی میں بڑے پیمانے پر سمینار کرایا، اس میں مدرسہ کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ دہلی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی، جامعہ ہمدرد دہلی، دار المصنفین اعظم گڈھ، شبلی کالج اور جامعۃ الفلاح بلریاگنج کے فضلاء نے مقالات پڑھے، مولانا کے ممتاز شاگرد، ادارۂ تدبر قرآن و حدیث کے سربراہ اور ماہنامہ تدبر کے لائق مدیر جناب خالد مسعود کی لاہور سے تشریف آوری نے سمینار کی رونق بڑھائی، اسلام آباد پاکستان کی نمایندگی ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی نے کی، نیپال سے بھی مدرسہ کے بعض فارغین نے شرکت کی۔

سمینار کا افتتاحی جلسہ ۲۴ فروری کو ۲ بجے دن میں جناب خالد مسعود کی صدارت میں ہوا، حافظ محمد نعیم نے جن آیتوں کی تلاوت کی ان کا ترجمہ مولانا امین احسن صاحب کا کیا ہوا بذریعہ کیسٹ پیش کیا گیا، طلبہ کے ترانے کے بعد راقم نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا، اس میں مہمانوں کا خیر مقدم، قصبہ سرائے میر اور مدرسۃ الاصلاح کی تاریخ اور مدرسہ کے لیے مولانا اصلاحی کی مساعی کا تذکرہ تھا، کلیم صفات اصلاحی (دار المصنفین) اور ضیاء الرحمن (طالب علم مدرسہ) نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا، پھر مولانا کی دو کم سن پڑپوتیوں سمیہ ریحان و اسماء ریحان نے ان کو یاد کیا اور دو شاگردوں مولوی عبدالرحمن ناصر اصلاحی اور راقم کے بڑے بھائی

جناب قمر اعظمی نے مولانا کے ساتھ گزرے ہوئے ۵۰ برس پہلے کے واقعات بیان کیے، جناب خالد مسعود کی صدارتی تقریر میں مدرسہ میں پہلی حاضری کے تاثرات اور مولانا سے اپنی چہل سالہ رفاقت کے واقعات کا ذکر تھا، مدرسہ کے معتمد تعلیم ڈاکٹر مظفر احسن اصلاحی کے کلمات تشکر پر یہ اجلاس برخواست ہوا۔

اسی دن مغرب بعد مقالات کا پہلا جلسہ راقم کی صدارت میں ہوا، اسی جلسے میں پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی نے اپنا مقالہ پڑھا، ان کی صدارت میں دوسرا جلسہ ۲۵ فروری کو ۸½ بجے سے ۱۱ بجے تک ہوا، اس میں خالد مسعود صاحب نے "مولانا امین احسن اصلاحی کی خدمت حدیث" کے عنوان سے مقالہ پڑھا، ۱۱ بجے سے ۱ بجے تک ہونے والے تیسرے جلسے کی صدارت مولانا نظام الدین اصلاحی نے فرمائی، اس میں راقم نے "الاصلاح کے شذرات" اور مولوی محمد عارف عمری نے "مولانا اصلاحی کی فقہی بصیرت" پر مقالے پیش کیے، اسی روز سہ پہر میں چوتھا جلسہ حکیم الطاف احمد اعظمی کی صدارت میں ہوا تو اس میں مولانا نظام الدین اصلاحی نے "مولانا اصلاحی کا طریقۂ تفسیر" اور مولوی حافظ عمیر الصدیق دریابادی نے "مولانا اصلاحی۔ دین کا ایک حقیقت نگار" کے عنوان سے مضامین پڑھے، پانچواں جلسہ ۲۶ فروری کو صبح میں ہوا اور مولانا احتشام الدین اصلاحی نے صدارت کی، اس کے خاص مقالہ نگار ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی اور حکیم الطاف احمد اعظمی تھے، سہ پہر کو مولانا عنایت اللہ سبحانی کی صدارت میں ہونے والے ساتویں جلسے میں ڈاکٹر ظفر الاسلام (علی گڑھ) وغیرہ کے مقالے ہوئے۔

اس سہ روزہ سمینار کی نظامت ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی (ریڈر شعبہ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے بڑے حسن و خوبی سے کی، ۳۰ مقالے پڑھے گئے، بعض مقالے وقت کی تنگی سے پڑھے نہیں گئے۔ مقالات پر بحث و مباحثے بھی ہوئے۔ گو سارے مقالے ایک سطح کے نہ تھے تاہم بعض تلاش و محنت سے لکھے گئے تھے اور بعض میں مولانا اصلاحی کی آراء سے اختلاف کیا گیا تھا۔ ان کی سیر

حدیث کے تعلق سے کیے جانے والے اکثر اعتراضات ان کے اصولِ تفسیر کو مدنظر نہ رکھنے کا نتیجہ تھے۔ ترجمے اور نحو و صرف کے تعلق سے کی جانے والی خوردہ گیری ع شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد کے مصداق تھی۔ ۲۵ فروری کو ۸ بجے شب میں انجمن طلبہ قدیم کے صدر مولانا احتشام الدین اصلاحی کی صدارت میں ایک عام جلسہ ہوا، اس میں قرب و جوار کے مسلمانوں نے بڑی تعداد میں شریک ہوکر پُرمغز اصلاحی و دینی تقریریں سُنیں۔

گزشتہ شمارے میں لکھنؤ جیسے مرکزِ علم و ادب سے اردو کے کسی اچھے روزنامہ کے شایع نہ ہونے کے ضمن میں روزنامہ قومی آواز اور بعض ہفت روزہ اخباروں اور ماہناموں کے بند ہوجانے پر افسوس ظاہر کیا گیا تھا، اسی سلسلے میں اب تک جاری دو ماہناموں کا ذکر بھی نوک قلم پر آگیا تھا۔ اس میں اس وقت تک شایع ہونے والے کسی ہفتہ وار اور پندرہ روزہ اخبار یا اس کی قومی و مذہبی اور علمی و تعلیمی خدمات کے ذکر کا کوئی موقع نہ تھا، مگر اس کی وجہ سے وہاں کے ایک ہفتہ وار سے وابستہ ایک صاحب نے بڑی برہمی کا خط لکھا ہے جو گو نظر انداز کرنے کے لایق تھا تاہم قارئین کی واقفیت کے لیے عرض ہے کہ ہمارے علم میں وہاں سے ہفت روزہ "ندائے ملت" عرصہ سے نکل رہا ہے اور اب حال ہی میں ہفت روزہ "توحید میل" نکلا ہے جو "ہماری توحید" کے نام سے ہندی میں پہلے سے شایع ہو رہا ہے، اس کے علاوہ ندوۃ العلماء سے پندرہ روزہ "تعمیر حیات" اور رابطہ ادب اسلامی کا سہ ماہی ترجمان "کاروان ادب" بھی شایع ہو رہا ہے، موخر الذکر بلند پایہ اور معیاری رسالہ ہے لیکن گزشتہ اشاعت کے شذرہ میں ان سب کے ذکر کا کوئی موقع نہ تھا، عرض تو یہ کرنا تھا کہ لکھنؤ بلکہ پورے اترپردیش سے کسی اچھے روزنامہ کا نہ نکلنا اردو والوں کے لیے باعثِ شرم ہے۔

مقالات

خلافت ارض کے لیے علم کیمیا اور طبیعیات کی اہمیت

جدید صنعتی علوم کا ایک تعارف

از

مولانا محمد شہاب الدین ندوی ٭

تجرباتی علوم قابل استدلال جدید سائنس اور ٹکنالوجی کے جو بھی کرشمے ظہور پذیر ہوئے ہیں وہ سب تجرباتی علوم کی بدولت ممکن ہوسکے ہیں، جن میں کیمیا اور طبیعیات کو بنیادی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ ان دو علوم میں مہارت کی بدولت آج نئے نئے تجربات کیے جارہے ہیں جس کے باعث نئے نئے حقایق و اکتشافات کا ایک تانتا سا بندھ گیا ہے۔ یہ علوم اور ان کے ذریعہ پوری صحت اور چھان بین کے ساتھ حاصل ہونے والے حقایق نہ صرف دلیل و حجت کے میدان میں قابل استدلال ہیں بلکہ عملی اعتبار سے تمدنی میدان میں بھی قابل استفادہ ہیں۔ گویا کہ دینی و دنیوی دونوں اعتبارات سے ان کی افادیت مسلم ہے اور ان علوم و مسائل میں کسی قسم کا "اتفاق" یا ان کے نظاموں میں کسی قسم کا انتشار یا پراگندگی موجود نہیں ہے۔ کیونکہ یہ علوم تجرباتی ہیں اور تجربات کی دنیا میں آج جو بات صحیح ہے وہ ایک سو سال بلکہ ایک ہزار سال کے بعد بھی صحیح رہے گی اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوسکے گی۔ مثال کے طور پر مسوڑی بس بطور تجربہ پانی کے ایک سالمے (MOLECULE) کو توڑا جائے تو ہمیشہ ایک ہی نتیجہ برآمد ہوگا یعنی ہائیڈروجن

٭ فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، بنگلور۔

کے دو ایٹم اور آکسیجن کا ایک ایٹم برآمد ہوں گے۔ پھر ان دونوں کو کیمیائی طریقے سے دوبارہ جوڑا جائے تو ہمیشہ ایک ہی نتیجہ نکلے گا، یعنی دوبارہ پانی کا سالمہ بن جائے گا۔ یہ ایک قانونِ قدرت (قانون ربوبیت) ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی حال نظام فطرت کے دیگر قوانین کا بھی ہے۔ انہی قوانین کی بنیاد پر سائنس اور ٹکنالوجی کے کارنامے وجود میں آرہے ہیں۔ چنانچہ آپ بجلی کا بٹن دبائیے بلب فوراً روشن ہوجائے گا، مشینیں چل پڑیں گی۔ استری گرم ہوجائے گی، ایرکنڈیشنر کام کرنے لگے گا، کمپیوٹر چل پڑے گا اور فیکس کے ذریعہ آپ کا پیغام آن کی آن میں دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ نتائج ہیں جو کبھی غلط نہیں ہوتے اور ان میں غلطی کا ایک فیصد بھی امکان نہیں ہے الا یہ کہ ان کے نظام میں کوئی خرابی پیدا ہوجائے۔

اس بحث سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہوگئی کہ تجرباتی سائنس میں تبدیلی محال ہے۔ کیونکہ وہ کارخانۂ قدرت میں موجود قوانین کا پتہ لگا کر ان کے مطابق کام کرتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے سارے طبیعی قوانین ایک قاعدہ اور نظام کے ذریعہ جاری کر دیے ہیں جن میں کبھی تغیر نہیں ہوتا۔ (ماتریٰ فی خلق الرحمٰن من تفاوت) اس اعتبار سے انسان کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتا اور کسی چیز کو عدم سے وجود میں نہیں لاتا۔ بلکہ قوانین قدرت کا کھوج لگا کر ان کی نقل کرتا ہے اور خلاق عالم نے اس کے لیے جو چیزیں پہلے ہی سے مسخر کر رکھی ہیں ان سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اشیائے عالم سے استفادہ کرکے اپنی زندگی اور تمدن کو بہتر سے بہتر بناتا ہے اور یہ سب کچھ تقدیر الٰہی (خدائی منصوبہ بندی) اور اس کے منشاء کے مطابق ہی ہو رہا ہے تاکہ انسان پر اللہ تعالیٰ کی نعمت اور حجت دونوں چیزیں پوری ہوجائیں، مطلب یہ کہ اللہ سے غافل انسان محض اپنے ذاتی مقاصد کے تحت اشیائے عالم کی کھوج کرید کرتا ہے مگر بے شعوری

کے عالم میں مادی نظاموں میں موجود "اللہ کی نشانیوں" کو نمایاں کر دیتا ہے جو خود اس پر حجت بن جاتی ہیں اور یہ خلاق فطرت کی عجیب و غریب منصوبہ بندی ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (حم سجدہ: ۵۳)

ہم منکرین حق کو عنقریب اپنی نشانیاں دکھا دیں گے ان کے اطراف (مختلف چیزوں میں) اور خود ان کے نفوس (جسمانی نظاموں) میں بھی تا آنکہ ان پر بخوبی واضح ہوجائے کہ یہ کلام برحق ہے۔

عناصر کی کارفرمائی

صحیفۂ فطرت میں جو قدرتی عناصر پائے جاتے ہیں ان کی تعداد ۹۲ ہے اور یہی عناصر مادی اشیاء کی تشکیل کرتے ہیں۔ چنانچہ زمین اور آسمان میں جو بھی چیزیں پائی جاتی ہیں سب کی سب انہی عناصر سے مرکب ہیں اور ان میں سے ہر ایک، ایک مخصوص خاصیت اور مخصوص فوائد کی حامل ہے، جن سے عملی طور پر استفادہ کیا جاتا ہے اور ان عناصر کو چند باہمی مناسبتوں کی بنا پر آٹھ زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ مگر اتنا ضرور عرض کیا جا سکتا ہے کہ یہ عناصر مجموعی اعتبار سے دو قسم کے ہیں: فلزی اور غیر فلزی۔ یعنی دھاتیں اور غیر دھاتیں۔ دھاتی عناصر مجموعی اعتبار سے ۸۳ فیصد اور غیر دھاتی عناصر ۱۷ فیصد پائے جاتے ہیں۔ قسم اول میں لوہا، تانبا، المونیم، کیلشیم، پوٹاشیم، میگنیشیم، سوڈیم، سیسہ، ٹن، زنک، سونا، چاندی، کوبالٹ، ریڈیم، تھوریم اور یورانیم وغیرہ وغیرہ شامل ہیں اور غیر دھاتی عناصر ہائیڈروجن، ہیلیم، کاربن، نائٹروجن، آکسیجن، سلکون، فاسفورس، گندھک، کلورین، بورون اور آیوڈین وغیرہ وغیرہ پر مشتمل ہیں۔

یہ عناصر جس طرح مظاہر کائنات کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں اسی طرح

جدید صنعت اور ٹکنالوجی میں بھی ان کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ چنانچہ اس موقع پر پہلے مظاہر عالم میں ان کی کارفرمائی پر ایک نظر ڈالی جائے گی اور پھر صنعت و حرفت میں ان کی جادوگری کا ایک جائزہ پیش کیا جائے گا۔

مثال کے طور پر پانی ہائیڈروجن اور آکسیجن دو عناصر کا مجموعہ ہے۔ اس کے ایک سالمے میں ہائیڈروجن کے دو اور آکسیجن کا ایک ایٹم موجود ہوتے ہیں۔ ہوا غالب طور پر نائٹروجن اور آکسیجن پر مشتمل ہے۔ چنانچہ تجرباتی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ اس میں ۵/۴ حصے نائٹروجن اور ۵/۱ حصہ آکسیجن موجود ہے اور کچھ دیگر گیسیں بھی قلیل مقدار میں پائی جاتی ہیں، مٹی یا قشرارض میں پائے جانے والے عناصر کی تفصیل اس طرح ہے: آکسیجن ۴۹٫۵ فیصد، سلکون ۲۵٫۷ فیصد، المونیم ۷٫۵ فیصد، لوہا ۴٫۷ فیصد، کیلشیم ۳٫۴ فیصد، سوڈیم ۲٫۶ فیصد، پوٹاشیم ۲٫۴ فیصد، میگنیشیم ۱٫۹ فیصد، ہائیڈروجن ۰٫۹ فیصد اور باقی عناصر ۱٫۴ فیصد[1]۔

حیوانات و نباتات کے خلیوں میں مشترکہ طور پر جو زندہ اور متحرک مادہ پایا جاتا ہے وہ حیاتیات کی اصطلاح میں پروٹوپلازم کہلاتا ہے اور وہ غالب طور پر حسب ذیل ۱۴ عناصر پر مشتمل ہے: آکسیجن، کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، کیلشیم، فاسفورس، کلورین، سلفر، پوٹاشیم، سوڈیم، میگنیشیم، لوہا، آیوڈین اور سیلکون اور اس سلسلے میں ایک اہم حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا عناصر میں حسب ذیل دس عناصر پروٹوپلازم کے اندر ۹۹ فیصد کی نسبت سے پائے جاتے ہیں اور باقی عناصر کی کارفرمائی صرف ایک فیصد ہے۔

آکسیجن (۶۲ فیصد) کاربن (۲۰ فیصد) ہائیڈروجن (۱۰ فیصد) نائٹروجن (۳ فیصد) کیلشیم (۲٫۵ فیصد) فاسفورس (۱٫۱۴ فیصد) کلورین ۰٫۱۶ فیصد) سلفر (۰٫۱۴ فیصد) پوٹاشیم (۰٫۱۱ فیصد) اور سوڈیم (۰٫۱۰ فیصد)۔[2]

بعض قرآنی حقائق

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں سامنے آنے والے بعض قرآنی حقائق و اسرار پر سے پردہ اٹھا دیا جائے جو اس کے علمی اعجاز کو ظاہر کر رہے ہیں۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا حیوانات و نباتات کا حیاتیاتی مادہ (پروٹوپلازم) چودہ عناصر پر مشتمل ہے اور یہ حقیقت سائنسی لیبورٹریوں میں کیے گئے تجربات کی رو سے ایک ثابت شدہ اور مسلمہ حقیقت ہے جس میں دنیائے سائنس میں دو رائیں نہیں ہیں۔ قشرارض میں پائے جانے والے یہ "غالب عناصر" قرآن کی اصطلاح میں "مٹی کا خلاصہ" کہلاتے ہیں، جن سے بنص قرآنی انسان کو پیدا کیا گیا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ (مومنون: ۱۲)
ہم نے انسان کو یقیناً مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا ہے۔

اس موقع پر لفظ سلالۃ استعمال کیا گیا ہے، جس کے معنی خلاصہ یا نچوڑ کے ہیں[3]۔ ہر فن کی اصطلاحیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ مگر قرآن عظیم کا کمال یہ ہے کہ وہ کائناتی حقائق کے سلسلے میں اصطلاحی زبان میں گفتگو کرنے کے بجائے ایسے بلیغ الفاظ استعمال کرتا ہے جو تحقیقات جدیدہ کی روشنی میں ابھر کر سامنے آجاتے ہیں اور ان میں تاویل کی ضرورت نہیں رہتی۔ بلکہ ان کا مفہوم منصوص طور پر دو اور دو چار کی طرح صادق آجاتا ہے۔ اصل میں یہ وہ قرآنی "متشابہات" ہیں جو مجاز و استعارہ کی زبان میں علام الغیوب کی جانب سے اپنی کتاب حکمت میں مندرج رہتے ہیں اور وقت آنے پر وہ "محکمات" کا روپ دھار لیتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ یہ کتاب حکمت اسرار کائنات کی جامع ہے:

قُلْ أَنْزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (فرقان: ۶)
کہدو کہ اس کتاب کو اس نے اتارا ہے جو زمین و آسمان کے (تمام)

بھیدوں کو جانتا ہے۔

اب جہاں تک انسان اور نباتات کے مادۂ حیات میں پائے جانے والے مشترکہ عناصر کا سوال ہے تو قرآن عظیم میں اس حقیقت کی نقاب کشائی چودہ سو سال قبل اس طرح کر دی گئی ہے:

وَاللّٰهُ اَنْبَتَكُمْ مِنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا۔ (نوح: ۱۷)　　اللہ نے تم کو زمین سے نباتات کی طرح اگایا ہے۔

یہ بلیغ اور حقیقت افروز تشبیہ علمی حقائق سے لبریز ہے۔ اس میں صرف عناصر ہی کا اشتراک نہیں بلکہ حیوانات و نباتات کے بنیادی ڈھانچے میں پائے جانے والے بہت سے اشتراکات کی طرف بھی ایک واضح اشارہ ہے۔ چنانچہ حیوانات و نباتات کے اجسام اور ان کے اندر پائے جانے والے جسمانی نظاموں کے خوردبینی مطالعہ سے بخوبی ثابت ہو چکا ہے کہ حیوانات و نباتات دونوں میں بنیادی طور پر "خلوی نظام" پایا جاتا ہے اور مادۂ حیات (پروٹوپلازم) خلیوں (ننھے ننھے خانوں) ہی میں موجود رہتا ہے اور جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے یہ مادہ غالب طور پر چودہ عناصر کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح حیوانات و نباتات میں نظام تنفس، نظام تغذیہ، نظام تحول، نظام نشو و نما اور نظام ازدواج تک مشترکہ طور پر پایا جاتا ہے اور یہی نہیں بلکہ خلیوں (CELLS) کے بننے اور بگڑنے کا عمل بھی دونوں میں یکساں ہے اور ان تمام اعتبارات سے حیوانات (جن کی نمائندگی اس موقع پر انسان کر رہا ہے) اور نباتات کی یکسانیت کی طرف چند مختصر مگر بلیغ الفاظ میں اشارہ کر دیا گیا ہے اور یہ علمی و آفاقی حقائق ہی قرآن عظیم کی اصل بلاغت اور اس کا عظیم ترین معجزہ قرار دیے جا سکتے ہیں۔

غرض حیوانات و نباتات کی اس یکسانیت سے وحدت تخلیق اور توحید باری تعالیٰ کی نوعیت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ حیوانات و نباتات کے ہزاروں بلکہ لاکھوں اختلافات کے

باوجود ان تمام انواع حیات کا بنیادی ڈھانچہ اور بنیادی نظام مشترک ہے جو توحید باری کی ایک عظیم الشان دلیل اور ایک حیرت انگیز علمی حقیقت ہے۔ اس اعتبار سے قرآن عظیم میں جو علمی اسرار مرقوم ہیں ان کی حیثیت محض "اخباری" نہیں بلکہ وہ علمی و آفاقی دلائل بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں، جن سے الحاد و مادیت کا رد ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآنی حقائق اور آفاقی حقائق و اکتشافات میں تطبیق ضروری ہے اور یہ فریضہ علمائے نابغین پر عائد ہوتا ہے کہ وہ جدید تجرباتی علوم کا جائزہ لے کر قرآن حکیم کے حقائق و اسرار اور اس کے دلائل کو واضح کریں۔

علم کیمیا کی جادوگری

یہ بات بطور جملہ معترضہ نوک قلم پر آ گئی۔ اصل بحث علم کیمیا پر چل رہی تھی۔ غرض قدرتی عناصر جن کی تعداد ۹۲ ہے، کرۂ ارض میں ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں جو علمی و عملی دونوں اعتبارات سے انسان کی عبرت و بصیرت کا سامان لیے ہوئے ہیں۔ عناصر کے ان نظاموں میں غور و خوض کرنے سے جس طرح خالق عالم کی ربوبیت و رحمانیت کا حال آشکارا ہوتا ہے اسی طرح عملی دنیا میں ان عناصر کی کارفرمائی سے نوع انسانی پر اللہ تعالیٰ کے احسانات اور اس کی نعمتوں کی کیفیت واضح ہوتی ہے۔

اس موقع پر صنعتی میدان میں علم کیمیا کی کارفرمائی اور جدید سائنس کی جادوگری کا ایک مختصر جائزہ پیش کرنا مقصود ہے جس نے عصر جدید میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جدید سائنس نے عناصر کے خواص و تاثیرات اور ان کے اندرونی بھیدوں سے واقف ہو کر اشیاء کی قلب ماہیت اور ان کی شکل و صورت تبدیل کر کے انہیں ایک نیا روپ دینے اور ان کے ذریعہ نئے نئے تمدنی مفادات حاصل کرنے کے گُر سے واقف ہو گئی ہے، جن کو ایک غیر سائنس داں حیرت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے سائنس دانوں کو خدائی کے مرتبے پر فائز سمجھنے

لگا ہے۔ چنانچہ اب عوام میں یہ تصور عام ہونے لگا ہے کہ آج کا "سائنس داں" جو چاہے" وہ کر سکتا ہے۔ حالانکہ یہ بیچارے صرف قوانین ربوبیت کی پیروی کرتے ہوئے خدائی ضوابط کی نقل اتارتے ہیں۔ کچھ بھی ہو اتنا ضرور ہے کہ جدید سائنس مادہ اور توانائی کے اندرونی اسرار وضوابط سے واقف ہو کر ایک "جادوگر" بن چکی ہے جو اشیاء کو الٹ پلٹ کر نئے نئے جہانوں کو سر کر رہی ہے اور بر و بحر کی تسخیر کر کے چاند ستاروں پر کمند پھینک رہی ہے۔ اسی طرح وہ زمین میں مدفون شدہ معدنی خزانوں کو کھوج نکالنے کے بعد اب اجرام سماوی میں موجود خزانوں کی طرف نگاہیں دوڑا رہی ہے۔

کاربنی مرکبات غرض آج ماہرین کیمیا لیبورٹریوں میں نئے نئے تجربات کر کے نئی نئی ایجادات واختراعات میں دن رات مصروف ہیں اور خاص کر صنعتی میدان میں ایک عظیم الشان انقلاب برپا کر چکے ہیں۔ چنانچہ آج مصنوعی غذاؤں، مصنوعی کھادوں، مصنوعی اشیاء اور مصنوعی ادویات کا دور ہے جو قدرتی پیداوار کی نقل کے طور پر اور مصنوعی طور پر کارخانوں میں تیار کیے جا رہے ہیں اور اس میدان میں ہزاروں لاکھوں صنعتیں مصروف عمل ہیں اور انکی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ آج مصنوعی اعتبار سے "مادے" یا جو چیزیں تیار کی جا رہی ہیں ان کی تعداد ساٹھ لاکھ تک جا پہنچی ہے[۲] اور یہ وہ مادے یا مرکبات ہیں جن میں کاربن بحیثیت ایک لازمی عنصر کے پایا جاتا ہے۔ اصلاحی طور پر ان مرکبات کو "نامیاتی مرکبات" (Organic Compounds) یا "کاربنی مرکبات" (Carbonic Compounds کہتے ہیں۔ ان کے بالمقابل وہ مرکبات جن میں کاربن شامل نہیں ہوتا، انہیں غیر نامیاتی مرکبات (Inorganic Compounds) کہا جاتا ہے۔

واضح رہے ۱۸۲۸ء سے پہلے کاربنی مرکبات کا اطلاق صرف زندہ اشیاء یا حیوانات

ونباتات سے تعلق رکھنے والی چیزوں ہی پر ہوتا تھا اسی بنا پر انہیں نامیاتی مرکبات کہا جاتا ہے مگر ۱۸۲۸ء میں ایک جرمن سائنس داں فریڈرک وولر نے اپنی تجربہ گاہ میں مصنوعی طور پر یوریا تیار کر لیا جو ایک نامیاتی مرکب ہے اور یہ کامیابی ایک تجربے کے دوران اتفاقاً ظاہر ہوئی[۵] مگر کیا تھا صنعتی میدان میں ایک عظیم انقلاب برپا ہو گیا اور نامیاتی مرکبات دھڑا دھڑ بننے اور تیار ہونے لگیں، جن سے آج بازار پٹے ہوئے ہیں۔ ان جدید صنعتوں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ کاربنی اشیاء کی تیاری کے لیے جو صنعتیں صرف خام مال فراہم کرتی ہیں خود ان کی تعداد آج پچاس ہزار تک جا پہونچی ہے[۶]

اس اعتبار سے آج صنعت و ٹکنالوجی کے میدان میں طبیعیات اور کیمیا کی بادشاہی نظر آ رہی ہے جو قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ جو قومیں ان علوم میں فائق ہیں وہ محض صنعت و حرفت ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ معاشی، تجارتی، تمدنی اور عسکری میدانوں میں بھی برتری حاصل کر کے دنیا بھر کی تجارتی منڈیوں پر قابض ہو چکی ہیں اور عالم اسلام اپنی غفلت کے باعث اس میدان میں پس ماندہ اور دیگر قوموں کا دست نگر بن کر رہ گیا ہے۔

دراصل علم کیمیا کے مطالعہ سے اشیائے عالم کی ماہیت اور ان کی ساخت و پرداخت کی معرفت حاصل ہوتی ہے جو دینی و دنیوی دونوں اعتبارات سے اہم ہے۔ بلکہ آج خلافت ارض کا دار و مدار عناصر کی معرفت اور ان کی تسخیر پر مبنی نظر آتا ہے جو آج قوموں کے عروج و زوال میں اہم رول ادا کر رہے ہیں اور یہ علوم قوموں کی فتح مندی کا نشان قرار پا چکے ہیں نیز ان علوم میں مہارت کے بعد قرآن عظیم کے حسب ذیل کلیات کی حقیقت بھی پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔

وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ۔ (رعد: ۸)	اور اس کے یہاں (اس کی مخلوقات و موجودات میں) ہر چیز ایک خاص مقدار میں ہے۔
وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (فرقان: ۲)	اس نے ہر چیز پیدا کی اور ہر چیز کا ایک (طبیعی) ضابطہ بنایا۔
إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ۔ (قمر: ۴۹)	ہم نے ہر چیز یقیناً ایک خاص ضابطے کے تحت بنائی ہے۔
مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَٰنِ مِنْ تَفَاوُتٍ (ملک: ۳)	تو خدائے رحمان کی تخلیق میں کسی قسم کا خلل نہیں دیکھے گا۔

علم کیمیا کی شاخیں علم کیمیا کی اس اہمیت کے بعد آیئے اس کے ذیلی علوم پر بھی ایک نظر ڈال لیں، تاکہ یہ بحث مکمل ہو جائے۔ چنانچہ علم کیمیا کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں: نامیاتی کیمیا (Organic Chemistry) اور غیر نامیاتی کیمیا۔ (Inorganic Chemistry)۔ قسم اول کے تحت نامیاتی مرکبات کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور قسم ثانی کے تحت غیر نامیاتی مرکبات کا مرکب کا مطلب ہر وہ چیز ہے جو دو یا دو سے زیادہ مفرد عناصر سے بنی ہوئی ہو۔ جیسے پانی ایک مرکب ہے جو ہائیڈروجن اور آکسیجن سے مل کر بنا ہے۔ اسی طرح کاربن ڈائی آکسائیڈ، نشاستے، مواد لحمیہ، چربی، شکر، تیل، لکڑی، کوئلہ، ربڑ، اسپرٹ، روئی، اون، گلوکوز اور نائیلان وغیرہ مرکبات ہیں جو مختلف عناصر سے مرکب ہیں۔

علم کیمیا کی دیگر شاخیں حسب ذیل ہیں:

۳۔ تحلیلی کیمیا (Analytical Chemistry) جو کیمیائی مادوں کے خصائص

اور مرکبات کی ساخت اور ان کے طبائع سے بحث کرتا ہے۔

۴۔ تطبیقی کیمیا (Applied Chemistry) اس علم کا تعلق کیمیائی مادوں اور ان کے تعاملات کی جانکاری سے عملی استفادہ کرنے سے ہے۔

۵۔ حیاتیاتی کیمیا (Biochemistry) اس علم کے تحت زندہ اشیا (حیوانات و نباتات) کے کیمیائی اعمال کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

۶۔ طبیعی کیمیا (Physical Chemistry) اس علم کی رو سے مادہ کے طبیعی خصائص کی اصطلاحوں میں کیمیائی اعمال کی تشریح کی جاتی ہے، جیسے متعلد مادہ، حرکت، حرارت، برق اور اشعاع۔

۷۔ ترکیبی کیمیا (Polymer Chemistry) اس علم کے تحت پلاسٹک اور دیگر چین جیسے سالموں سے بحث کی جاتی ہے جو چھوٹے چھوٹے سالموں سے تشکیل پاتے ہیں۔

۸۔ مصنوعی کیمیا (Synthetic Chemistry) اس علم کا تعلق ان کیمیائی عناصر اور مرکبات سے ہے جو نظام فطرت میں پائے جانے والے مواد یا مرکبات کی نقل ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر مصنوعی طور پر ایسے مرکبات تیار کرنا جو طبیعی اعتبار سے پائے نہیں جاتے ہیں۔

کیمیا دانی کا کمال اس آخری علم (مصنوعی کیمیا) کا تعلق نامیاتی کیمیا سے ہے، جو نامیاتی مرکبات سے بحث کرتا ہے اور جیسا کہ بتایا جا چکا نامیاتی مرکبات وہ ہیں جن میں کاربن بحیثیت ایک لازمی عنصر پایا جاتا ہے اور زیر بحث مسائل و مباحث کا تعلق اسی علم سے ہے۔ آج کل مصنوعی طور پر جو کیمیائی مرکبات صنعتی پیمانے پر تیار کیے جاتے ہیں وہ سب کے سب کاربن کی اس بنیادی خصوصیت ہی کی بنا پر ہیں کہ وہ دیگر عناصر کے برعکس مختلف طریقوں سے تعامل کرتے ہوئے لمبے لمبے سالماتی "چین" بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس صلاحیت

کی بناپر وہ مصنوعی مرکبات بنانے کا بھی اہل نظر آتا ہے۔ چنانچہ جن قدرتی اشیاء میں کاربن پایا جاتا ہے ان کے ذریعہ سائنس داں ایسے نئے نئے مصنوعات (مرکبات) تیار کرنے کے قابل بن گئے ہیں جو کارخانہ قدرت میں پائے نہیں جاتے اور ان مصنوعی یا نامیاتی مرکبات میں مختلف قسم کی ادویات، رنگ و روغن، خوشبوئیات، مصنوعی ریشے، پلاسٹک، دھماکہ خیز مادے، مصنوعی ربڑ، سمی اشیاء اور چکنا کرنے والے مادے وغیرہ شامل ہیں اور جیسا کہ بتایا جا چکا ان مصنوعات کی تعداد آج ساٹھ لاکھ تک جا پہونچی ہے اور اس وقت روئے زمین پر لاکھوں کارخانے ان اشیاء کی تیاری میں مصروف ہیں۔ ان اشیاء نے تمدن جدید میں بہت زیادہ اہمیت حاصل کرلی ہے اور ترقی یافتہ قومیں محض اپنی فنی واقفیت کی بنا پر سستی چیزوں سے یہ قیمتی اشیاء تیار کرتی ہیں اور خوب مالی منفعت حاصل کرتی ہیں۔ بلکہ انہوں نے اس باب میں اپنی اجارہ داری قائم کرلی ہے۔

جن خام اشیاء سے مذکورۂ بالا "نامیاتی مرکبات" تیار کیے جاتے ہیں ان میں پٹرول اور قدرتی گیس خاص طور پر شامل ہیں۔ نیز ان کے علاوہ کوئلہ چونے کے پتھر، ربڑ، لکڑی، درختوں کے ڈنٹھل کوڑا کرکٹ اور بھوسی جیسی معمولی چیزیں بھی شامل ہیں۔ چونکہ ان تمام اشیاء میں کاربن پایا جاتا ہے اس لیے ان کی شکل تبدیل کرکے انہیں دوسری شکل دینا بہت آسان ہوگیا ہے۔

معجزاتِ کیمیا قدیم کیمیا داں سستی دھاتوں کو سونے اور چاندی میں تبدیل کرنے کا خواب ہی دیکھتے رہ گئے، مگر جدید کیمیا دانوں نے ہر چیز کو گویا کہ "سونے" میں تبدیل کرنے کا گر معلوم کرلیا۔ اس اعتبار سے آج کیمیا کی جادوگری کا سکہ قائم ہوگیا ہے۔ چنانچہ آج کیمیا داں درختوں کی لکڑی سے ایسی ایسی چیزیں بنانے پر قادر ہوگئے ہیں جس پر عوام کو یقین کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر آج لکڑی سے کاغذ بنایا جارہا ہے، جس پر کتابت و طباعت

کا دارومدار ہے۔ لکڑی کو سیلولوز میں تبدیل کرکے اس سے پلاسٹک بنایا جارہا ہے، جس سے ہزاروں قسم کی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ لکڑی سے الکحلی مادے ایسڈ اور گوند بنائے جاتے ہیں۔ اسی طرح لکڑی سے خوبصورت قسم کا مصنوعی کپڑا بھی تیار کیا جارہا ہے۔ چنانچہ ایک ٹن لکڑی سے تقریباً ڈیڑھ ہزار میٹر مصنوعی ریشم بنایا جارہا ہے۔

اور جیسا کہ سب کو معلوم ہے کوئلہ ایک حقیر سی چیز ہے۔ مگر کیمیا داں اس حقیر سی چیز سے حیرت انگیز اشیاء تیار کرکے اپنی جادوگری ثابت کرچکے ہیں۔ چنانچہ آج کوئلے سے کھیتوں کی زرخیزی کے لیے مصنوعی کھادیں تیار کی جارہی ہیں، تمدنی ضروریات کے لیے پلاسٹک تیار کیا جارہا ہے، گھروں اور عمارتوں کی خوبصورتی کے لیے رنگ و روغن برآمد کیے جارہے ہیں، علاج و معالجے کے لیے دوائیں بنائی جارہی ہیں، جنگ و جدل کے لیے بارود اور دھماکہ خیز مادے تیار کیے جارہے ہیں، ملبوسات کو معطر کرنے کے لیے عطریات کی کشید کی جارہی ہے، حتیٰ کہ اس سے کھانے کے لیے سرکہ تک بنایا جارہا ہے۔

اسی طرح ربڑ سے آج تقریباً پچاس ہزار قسم کی تمدنی چیزیں بنائی جارہی ہیں، جن میں موٹروں اور کاروں کے ٹائر اور ٹیوب وغیرہ بھی شامل ہیں۔ آج جدید کیمیا دانوں نے ایسے ساٹھ قسم کے مرکبات کا پتہ چلا لیا ہے جو مصنوعی ربڑ کا بدل بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اس میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ نئے دریافت شدہ مرکبات بعض دیگر ضروریات میں بھی استعمال کیے جاسکتے ہیں جن میں ربڑ کا کوئی مقام نہیں ہے۔

پلاسٹک معمولی چیزوں سے بنایا جارہا ہے، جن میں کوئلہ پٹرول، قدرتی گیس اور چونے کے پتھروں کے علاوہ نمک اور لکڑی نیز بھوسی اور درختوں کے ڈنٹھل جیسی حقیر چیزیں بھی شامل ہیں۔ آج کیمیا داں کپڑے پر سیال پلاسٹک کی تہہ بچھا کر ایسی چیز تیار کرچکے ہیں جو

چمڑے کا بدل ہے۔ اسی طرح غذائی اشیاء کو جراثیم کی اثر اندازی اور ان کی سمیت سے محفوظ کرنے اور غذائی اشیاء کو ایک لمبے عرصے تک تر و تازہ رکھنے کا فن بھی علم کیمیا کی بدولت دریافت کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ آج غذائی اشیاء کو پکا کر انہیں سائنٹفک طریقے پر ڈبوں میں اس طرح محفوظ کر دیا جاتا ہے کہ وہ ایک مدت تک خراب نہ ہونے پائیں۔ یہاں تک کہ گوشت اور مچھلی مہر بند ڈبوں میں پیک کر کے محفوظ کر دیے جاتے ہیں۔

پٹرول اور پٹرولیم کی اشیاء

جیسا کہ اوپر بتایا گیا پٹرول اور گیس بھی نامیاتی مرکبات میں داخل ہیں، کیونکہ ان میں بنیادی طور پر کاربن کا عنصر شامل ہے۔ ان دونوں کی اسی خصوصیت کی بنا پر ان کے ذریعہ ہزاروں قسم کے نامیاتی مرکبات مصنوعی طور پر بنانا ممکن ہو گیا ہے۔ چنانچہ آج پٹرولیم یا کروڈ آئیل سے جو کیمیائی مصنوعات تیار کی جا رہی ہیں انہیں پٹروکیمیکلس (Petro-chemicals) کہا جاتا ہے، جو تمدن جدید کی جان ہیں۔ چنانچہ آج پٹرولیم سے پلاسٹک، ڈٹرجنٹس، دوائیں، کیمیائی کھاد، جراثیم کش اشیاء، مصنوعی ربڑ، عطریات، دھماکہ خیز مادے، چکنائی والے مادے، موٹر آئیل، موم بتیاں، رنگ و روغن، الکوحلی مادے اور سیال ایندھن وغیرہ وغیرہ ہزاروں قسم کی اشیاء تیار کی جا رہی ہیں۔

اس سلسلے میں بنیادی فارمولا یہ ہے کہ کچے تیل یعنی کروڈ آئیل کو سب سے ریفائنری میں صاف کیا جاتا ہے۔ یعنی اسے گرم کر کے مختلف چیزیں یکے بعد دیگرے حاصل کی جاتی ہیں چنانچہ تیل کو زیادہ گرم کرنے پر پٹرول کے بخارات حاصل ہوتے ہیں، مزید گرم کرنے پر کیروسین خارج ہوتا ہے اور پھر چکنا کرنے والا تیل، گریس، ویسلین، پیرافین اور اسفالٹ یکے بعد دیگرے حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ ان مرکبات کو دوبارہ صاف کر کے ان سے رنگ، کریم، موم، مصنوعی ربڑ اور جراثیم کش ادویات وغیرہ بنائی جاتی ہیں۔

اسی طرح پٹرولیم یا کروڈ آئیل سے ایتھین (Ethene) گیس اور پروپینن (Propanone) برآمد ہوتے ہیں۔ اول سے بطور ایندھن استعمال کیے جانے کے علاوہ خاص کر پولیتھین (Ploythene) بنانے کا کام بھی لیا جاتا ہے، جو آج کل وسیع پیمانے پر پیکنگ کے کام آتا ہے۔ نیز اس کے علاوہ ایتھین گیس کو مصنوعی طور پر پھلوں کو پکانے کے لیے بھی استعمال کیا جا رہا ہے اور پروپینن سے مصنوعی ربڑ اور ریان تیار کیا جاتا ہے، جو ریشم کی طرح نرم اور ملائم ہوتا ہے۔ اسی طرح اور بھی بے شمار چیزیں پٹرولیم سے بنائی جا رہی ہیں جن کی تفصیل بیان کرنا اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں ہے۔

یہ تو پٹرولیم سے بننے والی اشیاء کا حال ہوا، جب کہ خود پٹرول آج تمدن جدید میں شہ رگ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ چنانچہ موٹر ہو یا کار، ریل ہو یا ہوائی جہاز، اسکوٹر ہو یا ٹرک، نقل و حمل کے جتنے بھی ذرائع ہیں ان کا تقریباً سارا دار و مدار پٹرول اور ڈیزل ہی پر ہے۔ اگر پٹرول ختم ہو جائے تو پھر شاید کوئلے کا دور واپس آ جائے گا، یا پھر لوگ پیدل چلنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

پٹرول کی جنگ

پٹرولیم کی اہمیت کے بارے میں یہ ایک مختصر جائزہ ہے اور اس جائزے سے بخوبی واضح ہو گیا کہ نقل و حمل اور جدید صنعتوں میں اس کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی جیسی ہے اور تمدن جدید کی ساری رونق آج پٹرولیم اور طبعی گیس کی بدولت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے عالم اسلام کو اس قدرتی دولت سے نہال کر رکھا ہے۔ اس وقت اسلامی ممالک پٹرولیم کے دو تہائی ذخائر کے مالک ہیں، مگر سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں پیچھے ہو جانے کی وجہ سے اپنی قدرتی دولت کا صحیح استعمال نہیں کر پا رہے ہیں۔ بلکہ ترقی یافتہ قومیں مسلمانوں کی اس دولت کا استحصال کر کے انہیں جی بھر کے لوٹ رہی ہیں۔

چنانچہ اہل اسلام سے سستے بلکہ کوڑیوں کے داموں پٹرول خرید کر محض اپنی فنی مہارت کی بنا پر اپنی چاندی بنا رہے ہیں۔

پٹرولیم کی یہی وہ اہمیت ہے جس کی وجہ سے آج عالم اسلام اور خاص کر مشرق وسطیٰ میدان جنگ بنا ہوا ہے۔ چنانچہ اب بڑی قومیں اس سستی دولت کے حصول کے لیے مرنے مارنے پر آمادہ ہوگئی ہیں اور خلیجی ممالک کشاں کشاں تیسری جنگ عظیم کے دہانے پر پہنچ گئے ہیں۔ کیونکہ پٹرول کا مسئلہ اب محض ایک صنعتی مسئلہ نہیں رہا، بلکہ اس کے ساتھ تمدنی، اقتصادی، تجارتی اور عسکری مسائل بھی جڑے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی طاقتیں پٹرول کو ہر قیمت پر یقینی بنائے رکھنا چاہتی ہیں۔ اسی وجہ سے آج امریکہ خلیجی ممالک پر اپنی گرفت تنگ سے تنگ کرتا جارہا ہے اور اس کے قلب میں پیر پھیلا کر بیٹھ گیا ہے اور پڑوسی ممالک کو دھمکیوں پر دھمکیاں دیتا جارہا ہے اور انہیں بالکل غیر مسلح کر دینے پر اڑ گیا ہے تاکہ مغربی ممالک کے مفادات کے خلاف کوئی آواز بلند نہ ہو سکے۔ چنانچہ ایک بہت بڑی سازش کے ذریعہ ان ممالک میں دخیل بن کر اپنی من مانی کر رہا ہے اور دن رات نئی نئی سازشوں اور دسیسہ کاریوں میں مصروف ہے اور عرب ممالک محض اپنی سادہ لوحی کی بنا پر مغربی ڈپلومیسی اور اس کی چالوں سے مات کھا کر بلبلا رہے ہیں۔ اس اعتبار سے معاملہ بہت سنگین اور پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ یہ وہ صورت حال ہے جس سے آج عالم اسلام دوچار ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سارا فساد سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں عالم اسلام کے زوال و انحطاط کے باعث پیدا ہوا ہے۔ لہذا اب عالم اسلام کو اس میدان میں پھر سے آگے بڑھنے اور تلافی مافات کر کے اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرنے پر پوری سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے۔ عالم اسلام کی اس پسماندگی کی بدولت آج مسلمان دینی و دنیوی دونوں حیثیتوں سے زبردست نقصان سے دوچار ہیں۔

دینی اعتبار سے علم و استدلال اور دلیل و حجت کے میدان میں پیچھے ہوگئے اور دنیوی اعتبار سے تمدن و عسکریت کے میدان میں کمزور بن گئے، جب کہ اسلام ان دونوں میدانوں میں آگے بڑھنے کی تاکید کرتا ہے۔

پٹرولیم تاریخ کی روشنی میں

سائنسی تحقیق کے مطابق پٹرول وہ احفوری ایندھن ہے جو کروڑوں سال پہلے زمین پر بسنے والے حیوانات و نباتات کے زمین کے اندر دھنس جانے کی وجہ سے پیدا ہوا۔ یعنی ان کا وہ عرق ہے جو قشر ارض کے اندر موجود چٹانوں پر ٹھہر گیا۔ یونانی اور لاطینی زبان میں پٹرول کے معنی "چٹانی تیل" کے ہیں اور یہ تقریباً پانچ ہزار سال پہلے سے جانا پہچانا ہے۔ چنانچہ بعض قدیم قومیں جیسے اشوری اور بابلی وغیرہ اس سے واقف تھیں[۱] اور اہل عرب بھی اس سے واقف تھے اور اس سے اونٹوں کی مالش کیا کرتے تھے۔ نیز وہ اسے آگ جلانے کے لیے بھی استعمال کرتے تھے اور یہ چیز ان کے یہاں لفظ "نفط" کی حیثیت سے جانی پہچانی جاتی ہے اور یہ لفظ آج بھی پٹرول کے لیے جدید عربی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ صاحب لسان العرب علامہ ابن منظور اور صاحب تاج العروس علامہ مرتضیٰ زبیدی دونوں نے لفظ نفط کی تشریح کرتے ہوئے تصریح کی ہے کہ اہل عرب اس سے اونٹوں کی مالش کیا کرتے تھے اور اسے جلانے میں بھی استعمال کیا کرتے تھے اور یہ کہ یہ چیز کنوؤں کی تہہ میں پائی جاتی تھی اور جس مقام سے پٹرول نکالا جاتا تھا اسے "نفاطة" کہا جاتا تھا[۲]۔

علامہ زکریا محمود قزوینی (م ۶۸۲ھ) نے اپنی مشہور کتاب عجائب المخلوقات میں نفط یعنی پٹرول کا تذکرہ کرتے ہوئے اس دور کی ایک اہم معدنی چیز قرار دیا ہے اور تحریر کیا ہے کہ اگر کوئی شہر یا کوئی ملک اس سے خالی ہو جائے تو تمدنی اعتبار سے وہاں پر بگاڑ پیدا ہو سکتا ہے۔ موصوف کے الفاظ یہ ہیں:

ثم الی معادن الارض کالنفط والقیر والکبریات وغیرھا. واقلھا الملح
فلوخلت منہ بلد لتسارع الفساد الی اھلہا[۱۲]

اس بحث سے واضح ہوگیا کہ عربوں کے یہاں زمانہ قدیم میں پٹرول کی بہت زیادہ اہمیت
تھی، اگرچہ وہ اس کے جدید فوائد سے واقف نہیں تھے لیکن انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی تحقیق کے
مطابق پتہ چلا ہے کہ قرون وسطی میں عربوں نے پٹرول کو مقطر کرکے اس سے روشنی کا کام لینے
کا فن دریافت کرلیا تھا اور انہوں نے بارہویں صدی عیسوی میں مغربی یورپ کو اس فن
سے روشناس کرایا۔

Early in the Christian era the Arabs and Persians
developed an interest in crude petroleum and its
distillation into illuminants, and probably as the Result
of the Arabs invasion of Spain, the art of distilation was
available in western Europe by the 12th century [۱۳]

اس اعتبار سے پٹرولیم کی دنیا میں یہ پہلی تحقیق اور پہلا سائنسی اکتشاف ہے جو عربوں
کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوا۔ لیکن یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ انہوں نے اس میدان کو سر کرنے
کے لیے اہل مغرب کو تو جگا دیا مگر خود سو گئے۔ گویا کہ کلید برداران خلافت ارض کی چابیاں
دوسروں کے حوالے کرکے گوشہ نشین ہوگئے۔ چنانچہ مسلمانوں کی اس گوشہ نشینی کا نتیجہ یہ ہوا
کہ مغربی قومیں سائنس اور ٹکنالوجی کی قوتوں سے لیس ہوکر خلافت ارض کے میدان میں پوری طرح
فتح حاصل کرچکی ہیں اور صنعتی علوم سے لیس ہوکر کمزور قوموں کو اپنے پیروں تلے روند رہی ہیں اور
نوبت یہاں تک پہونچ گئی ہے کہ اب اس میدان میں پس ماندہ قوموں کو اف تک کرنے کی
بھی مجال باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اب ان کو یا تو بڑی طاقتوں کے اشاروں پر ناچنا پڑے گا یا پھر

بے موت مرنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ اب کوئی تیسری صورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔

تمدنی میدان میں پس ماندگی کے نتائج

ظاہر ہے کہ یہ ساری خرابی سائنس
اور ٹکنالوجی کے میدان میں مسلمانوں کے زوال وانحطاط کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ تمدنی، صنعتی
اور فوجی میدان میں کسی قوم کا پیچھے ہوجانا اس کی طبیعی موت کے برابر ہے۔ تو کیا اب بھی مسلمانوں
کے لیے وقت نہیں آیا کہ وہ طویل نیند اور خواب گراں سے بیدار ہوکر کار خلافت سنبھالیں؟
آخر وہ بڑی طاقتوں کا ظلم وستم اور ان کی چیرہ دستیاں کب تک برداشت کرتے رہیں گے؟
مسلمان صنعتی میدان میں کیا پیچھے ہوئے وہ تمدنی، اقتصادی، تجارتی، فوجی، سیاسی اور ڈپلومیسی
کے میدان میں بھی دیگر قوموں سے کوسوں دور ہوکر رہ گئے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو
بہترین امت بناکر مبعوث کیا اور ان کو امت وسط کے لقب سے نوازا ہے۔ تو پھر خلافت کے
میدان میں ان کی یہ پامالی اور پس ماندگی کیوں ہے؟ کیا وہ مادی میدان میں پیچھے ہوکر اپنی
روحانیت کو باقی رکھ سکتے ہیں؟ اسلام کا جواب ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ بلکہ خلافت کی تکمیل
کے لیے مادیت وروحانیت میں توازن ضروری ہے۔ کیونکہ مادیت اور روحانیت میں تفریق
کے باعث معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں اور اس میں قنوطیت، تشکیک اور فکری
انتشار کے جراثیم جنم لیتے ہیں، جو روحانیت کے ارتقاء کے لیے بہت بڑا خطرہ ہیں۔ اسلام چونکہ
ایک فطری اور حقیقت پسندانہ مذہب ہے، لہذا وہ بدھ مت اور عیسائیت کی طرح ترک دنیا
کی غیر فطری تعلیم دے کر معاشرہ میں انتشار برپا کرنے کا روادار دکھائی نہیں دیتا۔ اسی وجہ سے
اس کی تمام تعلیمات حد درجہ معقول، معتدل اور حقیقت پسندانہ ہیں۔ چنانچہ اس نے خلافت
ارض کے میدان میں مسلمانوں کو آگے بڑھا کر دنیا بھر کی تمام چیزوں کو مسخر کرنے اور ان کے دینی
ودنیوی فوائد سے متمتع ہونے کی پرزور تعلیم دے رکھی ہے۔ تاکہ مسلمان دینی ودنیوی کسی بھی حیثیت

سے کسی بھی دور میں کمزور یا پس ماندہ بن کر نہ رہ جائیں۔

واقعہ یہ ہے کہ سائنسی علوم صرف صنعتی و تمدنی حیثیت ہی سے اہم نہیں بلکہ وہ دینی و شرعی حیثیت سے بھی اہم اور انتہائی ضروری ہیں۔ کیونکہ ان علوم کے باعث علمی و استدلالی میدان میں دین و شریعت کے بازو مضبوط ہوتے ہیں اور اس کے نتیجے میں اعلائے کلمۃ اللہ اور احیائے دین عمل میں آتا ہے اور اس کے نتیجے میں مسلم معاشرہ میں احساس برتری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو قومی حیثیت سے انتہائی اہم نتیجہ ہے۔ چنانچہ قوموں کو زندگی کے میدان میں آگے بڑھانے کے لیے احساس برتری کے جذبے سے لیس ہونا ضروری ہے۔ ورنہ اس کے برعکس جو قوم احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے وہ دیگر مادی تہذیبوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی بلکہ جلد یا بدیر ان کا شکار بن کر اپنی قومی شناخت کھو دیتی ہے۔ جیسا کہ آج یہ تمام حالات ہمارے سامنے ہیں اور اس کے لیے مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

خلاصۂ بحث لہذا ضروری ہے کہ مسلمان خلافت کے میدان میں از سر نو آگے بڑھ کر تلافی مافات پر کمربستہ ہو جائیں۔ اسی غرض سے اللہ تعالیٰ نے ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام کو علم اسماء یا علم اشیاء سے نوازتے ہوئے ان کے سر پر خلافت ارض کا تاج رکھا تھا اور پھر ایک انوکھے قسم کا مقابلہ منعقد کر کے اس علم کی فضیلت و برتری بھی ثابت کر دی تھی تاکہ مسلمان کسی بھی دور میں اس علم کی اہمیت کو فراموش نہ کرنے پائیں۔ اس علم سے ہماری غفلت کے باعث اگرچہ ہم اس میدان میں بہت پیچھے ضرور رہ گئے ہیں، مگر تلافی مافات ہمارے لیے ناممکن نہیں ہے۔ جب کہ شرعی اعتبار سے یہ میدان سر کرنا ہمارے لیے واجب ہے۔ بے حس اور بے حمیت بن کر مزید ذلت و رسوائی برداشت کرنا ہمارے لیے شرعاً ناجائز ہے۔ رب العالمین کا منشا و مقصد تو یہ ہے کہ وہ اپنے دین کو دلیل و استدلال اور سیاست و عسکریت دونوں میدانوں میں غالب کرے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (توبہ: ۳۳، صف: ۹)

وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ وہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے، اگرچہ مشرکین اسے ناپسند ہی کیوں نہ کریں۔

امام قرطبی نے تصریح کی ہے کہ اس سے مراد حجت و برہان میں غلبہ ہے، جب کہ علامہ ابن کثیر نے صراحت کی ہے کہ اس سے مراد تمام ادیان پر فوجی و سیاسی اعتبار سے غلبہ مراد ہے[13]

حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں اعتبارات سے اہل اسلام کا دیگر ادیان و مذاہب اور اقوام عالم پر غلبہ و استیلاء مطلوب ہے اور جب تک مسلمانوں کو یہ تفوق حاصل نہ ہو جائے وہ دینی و دنیوی حیثیت سے ہمیشہ کمزور اور درماندہ رہیں گے اور موجودہ دور میں یہ مقام و مرتبہ حاصل کرنے کے لیے جدید سائنسی و صنعتی علوم میں پیش قدمی اور فنی اعتبار سے ان میں مہارت حاصل کرنا انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ آج قدریں بدل گئی ہیں اور تجرباتی علوم ہر اعتبار سے قوموں کی عظمت و برتری کا نشان قرار پا چکے ہیں، جنھیں کسی بھی حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اہل اسلام نے دیوار کے لکھے کو نظر انداز کر دیا تو وہ اس کی بہت بڑی سزا بھگتیں گے۔ سزا تو وہ اب بھی بھگت رہے ہیں، جب کہ آنے والا دور ان کے لیے مزید رسوا کن ہوگا۔ (خدا نخواستہ)

لہذا علمائے اسلام پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ جدید علوم سے چھوت چھات ترک کر کے میدان عمل میں آئیں اور مسلم معاشرہ کو ترغیب و تحریص کے ذریعہ کار خلافت میں آگے بڑھائیں تاکہ مسلمان عصر جدید کے چیلنجوں کا صحیح جواب دے کر دین ابدی کو ہر حیثیت سے غالب و برتر کر سکیں۔

مراجع

[1] دیکھئے کتاب Basic Concepts of Chemistry. p-284 [2] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا: ۴/۱۱۷، ایڈیشن ۱۹۸۳ء [3] دیکھئے تفسیر کشاف: ۳/۲۷، مطبوعہ تہران [4] دیکھئے کتاب "بیسک کانسپٹس آف کیمسٹری" ص ۴۶۶، مطبوعہ بوسٹن [5] دیکھئے حوالہ سابق، ص ۴۶۶ [6] دیکھئے حوالہ سابق، ص ۴ [7] ورلڈ بک انسائیکلو پیڈیا: ۳/۳۶۸، مطبوعہ لندن، ۱۹۹۶ء۔ [8] عجائبات کیمیا (دی ونڈرس آف کیمسٹری کا اردو ترجمہ) ص ۳۱، مطبوعہ لاہور [9] دیکھئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ۱۴/۱۶۵، مطبوعہ ۱۹۸۳ء [10] دیکھئے لسان العرب: ۷/۱۶۴، مطبوعہ دار صادر بیروت اور تاج العروس ۱۰/۳۳۴، دار الفکر بیروت، ۱۴۱۴ھ [11] عجائب المخلوقات، زکریا محمود قزوینی، ص ۱۳، مکتبہ امویہ [12] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا: ۱۴/۱۶۴، مطبوعہ ۱۹۸۳ء [13] دیکھئے الجامع الاحکام القرآن: ۸/۱۲۱، اور تفسیر ابن کثیر: ۲/۳۴۹، مطبوعہ قاہرہ۔

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت	: دار المصنفین اعظم گڈھ	پتہ	: دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	: ماہانہ	نام پبلشر	: " " "
نام پرنٹر	: عبد المنان ہلالی	ایڈیٹر	: ضیاء الدین اصلاحی
قومیت	: ہندوستانی	قومیت	: ہندوستانی

نام و پتہ مالک رسالہ : دار المصنفین

میں عبد المنان ہلالی تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ عبد المنان ہلالی

عیون الانباء فی طبقات الاطباء

از پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل، اسلام آباد

(۲)

پیش گوئیاں

ابن ابی اصیبعہ کو صحیح ثابت ہونے والی پیش گوئیوں سے خصوصی دلچسپی تھی اس نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب اصابات المنجمین بھی لکھی[1] اور عیون الانباء میں بھی جابجا صحیح ثابت ہونے والی پیش گوئیوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے اہم ترین پیش گوئی ابن سینا کی طرف منسوب وہ باون اشعار پر مشتمل قصیدہ ہے[2] جس میں تاتاریوں کی تباہ کاریوں اور آخرکار وادی کنعان میں الملک المظفر (۶۵۷-۶۵۸ھ/۱۲۵۹-۶۰) کے ہاتھوں شکست کھانے کا ذکر کیا ہے۔ اگر اس قصیدہ کی نسبت ابن سینا کی طرف درست ہے تو یہ امر یقیناً انتہائی تعجب انگیز ہے کہ اس نے ایک سو تیس سال بعد پیش آنے والے واقعات کو اتنی دقت اور صحت سے بیان کیا ہے جیسے ماضی کے احوال بیان کیے جاتے ہیں۔ ابن ابی اصیبعہ کو اس قصیدہ کے ابن سینا کی طرف منسوب ہونے اور اس کے پیش گوئی ہونے میں شبہ ہے جس کا اس نے کئی جملوں میں اظہار کیا ہے[3]۔

اسی طرح شرف الدین ابو الحسن علی بن یوسف الرحبی (م ۶۶۷ھ/۱۲۶۹ء) کے ترجمہ میں مذکور ہے کہ اس نے اپنی وفات سے چند ماہ قبل اپنے احباب اور تلامذہ کو بتا دیا تھا کہ تھوڑے عرصے بعد قران الکوکبین کے موقع پر میں وفات پا جاؤں گا اور یہ بھی کہا کہ لوگوں کو یہ بات بتا دو

(الف)

تاکہ انہیں میرے علم کا اندازہ ہو سکے چنانچہ وہ اپنے بتائے ہوئے وقت پر فوت ہوگیا۔

حکایات ولطائف | ابن ابی اصیبعہ نے اپنی کتاب میں متعدد لطائف بیان کیے ہیں جن سے ایک طرف قاری کی فرحت و انبساط کا اہتمام ہوتا ہے تو دوسری طرف خود مصنف کے حسن ذوق کی نشاندہی ہوتی ہے۔

مثلاً المتوکل کے دربار میں ایک آدمی کا قارورہ یوحنا کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے کہا یہ خچر کا پیشاب ہے۔ المتوکل نے کہا: یہ تم کیسے کہتے ہو؟ اس نے جواب دیا: مریض کو لائیں تاکہ میرا سچ جھوٹ واضح ہو جائے۔ مریض کو بلایا گیا تو یوحنا نے اس سے پوچھا کہ تم نے رات کیا کھایا تھا۔ اس نے جواب دیا: جو کی روٹی اور سادہ پانی تو یوحنا نے کہا: خدا کی قسم رات میرے گدھے کی بھی یہی خوراک تھی۔

یوحنا بن ماسویہ خلیفہ الواثق کے ساتھ دجلہ کے کنارے بیٹھا ہوا تھا اور خلیفہ نے مچھلیاں شکار کرنے کے لیے دریا میں جال ڈال رکھا تھا۔ جب بہت دیر گزر گئی اور کوئی مچھلی جال میں نہ آئی تو الواثق نے یوحنا کی طرف متوجہ ہو کر کہا: اٹھو، منحوس! اپنی شکل غائب کرو، تمہاری نحوست کی وجہ سے کوئی مچھلی نہیں آرہی۔ یوحنا نے جواب دیا: میں بتاؤں منحوس کون ہے۔ وہ شخص جو چار خلفاء کی اولاد ہے اور خود خلیفہ ہے لیکن اپنے محلات و باغات چھوڑ کر دجلہ کے کنارے دنیا کی ذلیل اور محتاج ترین قوم کا ایک فرد مچھیرا بن کر بیٹھا ہے۔

اس نوع کے اور متعدد واقعات ہیں لیکن ان میں ظرافت کے بجائے ابتذال کا رنگ غالب آگیا ہے۔ اس لیے انہیں نظر انداز کر دیا گیا۔

احادیث | اگرچہ عیون الانباء حدیث کی کتاب نہیں ہے لیکن مختلف مواقع پر کسی نہ کسی مناسبت سے کچھ احادیث اس میں درج ہوئی ہیں ان کی کل تعداد دس ہے۔ ان میں سے بیشتر احادیث مختصر ہیں۔

البتہ دو احادیث نسبتاً طویل ہیں اور یہ دونوں احادیث ابن ابی اصیبعہ نے محدثین کے طریقے کے مطابق پورے سلسلۂ سند کے ساتھ بیان کی ہیں۔ پہلی حدیث میں ابن ابی اصیبعہ اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان گیارہ واسطے ہیں اور دوسری میں بارہ۔ پہلی حدیث النضر بن الحارث بن کلدہ کے قتل سے متعلق ہے جو غزوہ بدر میں گرفتار ہوگیا تھا اور بدر سے واپسی پر الصفراء کے مقام پر قتل کر دیا گیا۔ دوسری حدیث دعا استسقاء سے متعلق ہے جس میں مدحت نبوی پر ابوطالب کے ایک مشہور قصیدہ کے چار اشعار ہیں۔ ایک شعر یہ ہے:

وابیض یستسقی الغمام بوجهه ثمال الیتامی عصمة للارامل

"گورا چٹا، جس کے چہرے کی برکت سے بارش کی دعا مانگی جاتی ہے، یتیموں کا والی، بیواؤں کی پاکبازی کا سہارا۔"

علم حدیث سے ابن ابی اصیبعہ کے شغف کے باوجود مغازی و سیر سے متعلق اس کی معلومات مستند نہیں ہیں۔ غزوہ بدر کے بارے میں لکھتا ہے:

اقول: ولما کان یوم بدر والتقی فیه	غزوہ بدر میں جب مسلمانوں اور مشرکین
المسلمون ومشرکوا قریش	کا آمنا سامنا ہوا تو مشرکین کے لشکر کا
کان المقدم علی المشرکین	سردار ابوسفیان تھا۔
ابوسفیان	

جب کہ مفسرین، محدثین اور ارباب مغازی و سیر کا اتفاق ہے کہ مشرکین کے لشکر کا سپہ سالار ابوجہل تھا اور ابوسفیان غزوہ بدر میں شریک نہیں تھا۔

عناصر تصوف | ابن ابی اصیبعہ نے متعدد حکماء کے جو پُرحکمت مقولے لکھے ہیں ان میں سے کئی ایک ایسے ہیں جنہیں ابواب الزہد والرقاق میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک ایسی تحریر بھی

کتاب میں شامل کی ہے جس کا تعلق براہ راست تصوف کی ان روایات سے ہے جن کی بہت سی باتیں تحقیق طلب ہیں۔ اس نے اپنے چچا رشید الدین علی بن خلیفہ کی خرقہ پوشی کے تذکرے میں ابن حمویہ عمر بن ابی الحسن سے ملنے والی سند تصوف من وعن نقل کر دی ہے جس میں ابن حمویہ نے یہ دعوی کیا ہے کہ اس کے دادا نے خرقہ تصوف خضر علیہ السلام سے حاصل کیا اور انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے [۱۲]

کرد علی کی رائے یہ ہے کہ اس روایت کے ذکر سے ابن ابی اصیبعہ ان واہی معتقدات اور خرافات کا پردہ چاک کرنا چاہتا ہے جو متصوفین نے عوام الناس کو گمراہ کرنے کے لیے تراشے ہیں۔ کیونکہ خضر کا وجود عنقا ہے [۱۳] لیکن ابن ابی اصیبعہ کی تحریر میں کرد علی کی رائے کی تائید میں کوئی بات نہیں ملتی۔

عیون الانبار فی طبقات الاطبار کی ادبی اہمیت | اس نوع کی دیگر تالیفات کے بر عکس ابن ابی اصیبعہ نے مختلف ذوق کے قارئین کا خیال رکھتے ہوئے کتاب کو دلچسپ بنانے کے لیے اسے ادبی اعتبار سے مالا مال کر دیا۔ یہ ایک غیر معمولی امر ہے کہ ایک ایسی کتاب میں جو بنیادی طور پر طبقات الاطبار کے موضوع پر ہے مختلف اور متنوع اسالیب و موضوعات پر تین ہزار چار سو نو اشعار شامل ہیں جن میں سے اکثر ان لوگوں کے ہیں جن کے تراجم ہیں اور کہیں کہیں وہ اشعار ہیں جو دوسرے شعراء نے ان لوگوں کے بارے میں کہے ہیں۔ ان میں سے بڑی تعداد ایسے شعراء کی ہے جو ابن ابی اصیبعہ کے ہم عصر یا قریب العہد ہیں۔ اس سے جہاں عربی ادب بالخصوص شاعری میں مصنف کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کئی ایسی شخصیتیں جن کی شہرت بحیثیت طبیب یا فلسفی ہوئی ہے بلند پایہ شاعر بھی تھیں اور کئی نامور شعراء طبیب بھی تھے [۱۴] کتاب کے متنوع مضامین سے متعدد لوگوں کی جامعیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ

بیک وقت طب، فلسفہ، ادب، فقہ، نحو، لغت، تاریخ، سیر اور تفسیر وحدیث وغیرہ کے ماہر عالم تھے۔

ابن ابی اصیبعہ نے شاعری کے جو نمونے دیے ہیں ان میں مختلف اور متنوع ابواب و موضوعات سے متعلق قصائد واشعار ہیں۔ قصائد کا بڑا حصہ مدیح پر مشتمل ہے جس میں بالعموم ان لوگوں کی تعریف میں اشعار ہیں جن کے تراجم ہیں۔

کتاب کا اصل موضوع علوم حکمیہ کی تاریخ ہے اس لیے ایسے اشعار و قصائد کی تعداد بھی خاصی ہے جو علوم حکمیہ سے متعلق ہیں۔ اس کی بہترین مثال ابن سینا کا قصیدۃ فی النفس ہے [۱۵] جو انیس اشعار پر مشتمل ہے نیز ابن الشبل البغدادی کا طویل قصیدہ جو پچاس اشعار پر مشتمل ہے [۱۶] علوم حکمیہ اور اسرار الٰہیہ کے مضامین پر مشتمل ہے۔

مصنف نے ہجویہ اشعار بھی بڑی تعداد میں دیے ہیں جن سے بعض اطباء کے بارے میں لوگوں کی رائے یا ان کے باہمی معاشرتی روابط پر روشنی پڑتی ہے۔ اس ضمن میں بعض اشعار خاصے دلچسپ ہیں مثلاً المختار بن الحسن ابن البطلان بغدادی اور علی بن رضوان مصری کے درمیان تحریری نوک جھونک جاری رہتی تھی۔ ابن رضوان سیاہ رنگ اور کریہہ المنظر تھا۔ اس کی ہجو کرتے ہوئے ابن بطلان کہتا ہے:

فلما تبدى للقوابل وجهه   نكصن على اعقابهن من الندم

وقلن واخفين الكلام تسترا   الا ليتنا كنا تركناه فى الرحم

جب اس نے دائیوں کے سامنے اپنا چہرہ ظاہر کیا تو انہوں نے ندامت سے سر جھکا لیا اور چپکے چپکے ایک دوسری سے کہنے لگیں، کاش ہم اسے رحم ہی میں رہنے دیتے۔ [۱۷]

سلامہ بن رحمون مصر کا ایک طبیب ہے اس کی نحوست کو ایک دوسرا طبیب جرجس ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

ان ابا الخیر علی جهله یخف	ابو الخیر اپنی جہالت کے باعث فاضل
فی کفته، فاضل علیله المسکین	آدمی کو بھی ہلکا سمجھتا ہے اس کا مریض
فی شومه فی بحر هلک ماله	اس کی بدبختی کے باعث ساحل ناآشنا
ساحل ثلاثة تدخل فی دفعة	بحر ہلاکت میں غوطے لگاتا ہے، اس کی
طلعته والنعش والغاسل	بدبختی میت کی چارپائی اور غسل دینے
	والا تینوں اکٹھے داخل ہوتے ہیں[۱۸]

ابن جمیع مصر کا ایک یہودی طبیب تھا۔ ابن المنجم المصری نے اس کی ہجو میں بہت اشعار کہے۔ مصنف نے ان میں سے آٹھ منتخب اشعار نقل کیے ہیں۔ ان میں سے دو درج ذیل ہیں:

کذبت وصحفت فیما ادعیت	وقلت ابوك جمیع الیهودی
ولیس جمیع الیهودی اباك	ولكن اباك جمیع الیهود

"تو نے جھوٹ کہا اور اپنی نسبت میں گڑبڑ کر دی اور کہنے لگا کہ جمیع یہودی تمہارا باپ ہے۔ حالانکہ جمیع یہودی تمہارا باپ نہیں بلکہ تمام یہودی تمہارے باپ ہیں"[۱۹]

ہجو کے ضمن میں عیون الانبار میں کچھ مثالیں ایسی بھی ہیں جو اب مکشوف کے ذیل میں آتی ہیں جن میں غیر فطری افعال اور علت اُبنہ کا صاف صاف الفاظ میں ذکر ہے بلکہ ایک مقام ایسا بھی ہے جہاں ابن ابی اصیبعہ نے زیادہ فحش الفاظ حذف کر دیے اور اشعار کو نامکمل چھوڑ دیا ہے[۲۰]

مصنف نے کئی ایک مرثیے بھی نقل کیے ہیں جن میں سب سے انوکھا مرثیہ ابوالحکم کا ہے جس نے اپنا مرثیہ خود کہا تھا اور اپنے بیٹے ابوالمجد سے کہا کہ میرے مرنے کے بعد لوگوں کو سنایا جائے۔

مرثیہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

"میں اپنی موت پر نادم ہوں لیکن میرے بس میں کچھ نہیں، افسوس، میرے بعد تمہارے مرثیے کون لکھے گا (ابوالحکم ازراہ مزاح زندہ افراد کے مرثیے کہا کرتا تھا، اسی کی طرف اشارہ ہے) اگر مجھے واپس بھیج دیا گیا تو میں واپس آنے کو ترجیح دوں گا، لیکن واپسی کی کوئی راہ نہیں ہے"[۲۱]

اس کے علاوہ ظریفانہ شاعری[۲۲]، خمریات[۲۳]، کتابوں کی تعریف[۲۴]، نصیحت[۲۵]، ذکر الموت والمعاد[۲۶] اور دیگر متعدد عنوانات سے متعلق شاعری کے نمونے درج کیے گئے ہیں۔

اگرچہ عیون الانبار کے اس پہلو کا کتاب کے اصل موضوع سے بہت کم تعلق ہے اور طویل غیر متعلق قصائد و اقتباسات کی وجہ سے کتاب کے حجم میں بہت اضافہ ہوگیا ہے تاہم اس سے کتاب کی ادبی افادیت بڑھ گئی ہے۔

بیاض عیون الانبار

عیون الانبار میں پچیس مقامات ایسے ہیں جہاں مصنف نے مسلسل عبارت میں خالی جگہ چھوڑ دی ہے۔ اسے خیال رہا ہوگا کہ بعد میں تحقیق کر کے انہیں پُر کر دے گا لیکن کتاب کے جو نسخے ہم تک پہنچے ہیں ان میں بیاض موجود ہیں[۲۷]۔ ان میں سے اکثر کو دیگر مراجع کی مدد سے پُر کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ذیل میں ان کی نشاندہی کر کے انہیں پُر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

صفحہ	سطر	بیاض	ملاالفراغ
۲۸۶ عہ	۱۸	وکان مولده بواسط یوم الاربعاء للیلتین بقیتا	..... سبعین ومائة .....[۲۸]

عہ مقالہ نگار نے عیون الانبار کے جس نسخہ کا حوالہ دیا ہے اس کے مطبع و سن اشاعت کی صراحت نہیں کی ہے (معارف)

		من شهر رمضان سنة	
		..... وتوفى ابو معشر	
		وقد جاوز المائة سنة	
۲۹۳	۹	ومضى بعد ان بلغ السماء	اثنين وثمانين
		رفعة فى سنة	ومائتين [۲۹]
		وكان القبض	
۳۰۳	۱۶	اصلاحه لكتاب......	..... افلاطن [۳۰]
		فى الاصول	
۳۱۰	۲۲	لامثل له فى صناعته	... وفيروز [۳۱]
		.... وهو	....
		قليل التحصيل	
۳۳۳		وكانت وفاته سنة	..... ثلاثين [۳۲]
		....	....
		واربعمائة	
۳۳۸	۱۳	قد حضر بغداد فى	.... اثنين [۳۳]
		سنة	وخمسين .....
		وخمسمائة	
۳۰۲	۹	ولتوفى رحمه الله	..... نيف واربعين
		فى سنة	وخمسمائة [۳۴]

۳۶۲	۲۲	كنت ببلد هراة	...... نيف ......
		فى سنة	(من واحد الى اربع) [۳۵]
		و ستمائة	
۳۷۲	۲۴	وتوفى ايام خوارزم شاه	..... مرو..... [۳۶]
		بمدينة ..	
		....	
۳۸۹	۲۲	بالمبردات شيئا	.... الحواس ..... [۳۷]
		من....... وله	
۴۹۶	۲۱	هو..........	نام معلوم نہیں ہوسکا۔
		وكان بالمرية	
۵۱۸	۱۷	توفى ابو العلاء	.... خمس وعشرين
		بن زهر فى سنة	وخمسمائة [۳۸]
		....	
۵۲۱	۶	توفى ابو مروان	.... سبع
		عبد الملك بن	وخمسين [۳۹]
		ابى العلاء	
۵۳۸	۲۱	هو....... من	نام معلوم نہیں ہوسکا۔
		الاطباء المشهورين	
۵۴۵	۲	هو........ كان	نام معلوم نہیں ہوسکا۔
		طبيباً فاضلا	

۵۷۴	۱	سنة .... وخمسمائة	............خمس وخمسین [40]
۵۸۱	۲۱	......الانصف زاویة	ادنی تفکر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں مبتذل الفاظ تھے جو قصداً ترک کر دیے گئے ہیں۔
۵۸۳	۱۲	بمصر فی سنة ..... وثلاثین	.....خمس.....[41]
۶۱۳		وتوفی الیبرودی بدمشق فی سنة واربعمائة	.... ست وعشرین [42]
۶۲۸	۱۷	وتوفی ابو المجد بن ابی الحکم بدمشق فی سنة ..... وخمسمائة	...... سبعین .....
۶۳۰	۹	وتوفی بدمشق فی سنة .... وستمائة	...... اثنین .....[43]
۶۳۰	۱۱	وتوفی بمدینة رها فی سنة... ....عشرین	...... نیف و......[44]

۶۴۱	۲۳	ابو حفص عمر بن	......حبش......[45]
۶۵۶	۲۷	والآخر...... ابن الیاس	نام معلوم نہیں ہو سکا۔
۷۱۷	۲۰	وذکر لی انه نظمها فی یومین وهی .... بیت	اشعار کی تعداد معلوم نہیں ہو سکی۔

حواشی

[1] اصیبعہ، ۳۷۷ [2] ایضاً، ۳۵۴-۶ [3] ایضاً، ۳۵۴ [4] ایضاً، ۶۷۶ [5] ایضاً، ۲۵۳ [6] ایضاً، ۲۴۹ [7] ایضاً، ۲۴۸، ۵۸۱ [8] ایضاً، ۱۷، ۱۶۱، ۱۶۵، ۱۶۹-۷۰، ۱۷۱، ۲۲۷، ۶۸۵، ۴۰۷-۵، ۱۶۷، ۴۰۳-۳ [9] ایضاً، ۱۶۹-۷۰، ۴۰۷-۵ [10] ایضاً، ۱۶۹ [11] تمام متداول تفاسیر ذیل سورۃ انفال، کتب احادیث وسیرت ذیل غزوۂ بدر میں تصریح موجود ہے [12] اصیبعہ، ۴۰۷-۱ [13] کنوز الاجداد، ۳۳۹ [14] اس کی بہترین مثال ابن سینا (ص ۴۳۳-۵۹)، ابو الصلت امیہ بن عبد العزیز (ص ۵۰۱-۱۴)، ابن الشبل البغدادی (ص ۳۳۳-۴۰) اور العنتری (ص ۳۸۹-۹۹) کی جامع شخصیات ہیں [15] اصیبعہ، ۴۴۶ [16] ایضاً: ۳۳۳-۵ [17] ایضاً، ۳۲۶ [18] ابو الخیر سلامہ بن رحمون کی کنیت تھی [19] اصیبعہ، ۵۶۹ [20] ایضاً، ۵۷۸ [21] دیکھیے: اصیبعہ، ۳۹۸، ۵۸۱، ۷۱۹-۲۰ [22] اصیبعہ، ۶۲۷ [23] ایضاً، ۶۳۹ [24] ایضاً ۴۳۳، ۶۰۰ [25] ایضاً، ۶۲۹ [26] ایضاً، ۳۹۰، ۳۹۳ [27] ایضاً، ۶۲۹ [28] نزار رضا نے عیون الانباء کا شرح وتحقیق کے ساتھ جو نسخہ شائع کیا ہے اس میں فراغات کو پر کرنے کے بجائے حاشیہ پر صرف یہ نوٹ دیا ہے "بیاض فی الاصل" [29] ابن خلکان، وفیات الاعیان، بیروت ۱۹۷۲، (۱: ۳۵۶)

نے اس کا سن وفات ۶۰۲ھ بتایا ہے اور ابن ابی اصیبعہ نے سو سال سے زائد اور ولادت ۲۷ شعبان بروز بدھ اس حساب سے اس کی ولادت ۵۰۲ھ سے قبل ہونی چاہیے چنانچہ ۲۷ شعبان کو بدھ کا دن سن ۵۰۱ھ میں آتا ہے اس لیے یہ بیاض " سبعین ومائۃ سے پُر کیا گیا ہے [30] یاقوت الحموی' ارشاد الاریب القاہرۃ، ۱۹۳۶ء ۳: ۹۹ [31] القفطی' تاریخ الحکماء ۱۹۵ [32] القفطی' ۱۱۳ [33] کحالہ' عمر رضا معجم المولفین' بیروت، ۱۹۵۷ء ۷: ۱۶۳ [34] خلکان' ۵: ۱۸۳ [35] دیکھئے' اصیبعہ' ۶۳۹' سطر ۳-۴ [36] اس واقعہ کی داخلی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۶۰۱ھ سے ۶۰۴ کے درمیان کا ہے۔ کیونکہ اس موقع پر حسین بن خرمیل ہرات میں موجود تھا، جس کا ۶۰۴ھ میں انتقال ہو گیا۔ دیکھئے: ابن اثیر' الکامل فی التاریخ' ۱۲: ۲۶۰ [37] کحالہ' ۲: ۲۶۴ [38] ابن جلجل' طبقات الاطباء والحکماء' القاہرہ ۱۹۵۵ء، ۱۰۴ [39] ابن خلکان' ۴: ۳۳۶ [40] ایضاً [41] الکامل فی التاریخ' ۱۱: ۲۵۵ [42] ابراہیم بن موسیٰ کی ابن ابی اصیبعہ سے ۶۳۲ میں قاہرہ میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد اسی عشرے میں فوت ہوا۔ الدومیلی' العلم عند العرب' (عربی) القاہرہ ۱۹۶۲' (ص ۵۶۶) کے مطابق ۱۲۳۷ھ میں یعنی ۶۳۵ھ میں [43] کحالہ' ۳: ۱۲۳ [44] النعیمی' عبدالقادر' الدارس فی تاریخ المدارس' دمشق ۱۳۶۷' ۲: ۱۳۸ [45] الکتبی' ابن شاکر' فوات الوفیات' القاہرہ ۱۹۵۱' ۲: ۳۵-۶ یاقوت الحموی' معجم البلدان' بیروت' ۲: ۱۲۰

علامہ شبلی کے مقالات

مرتبہ سید سلیمان ندویؒ

۱- مقالات شبلی اول (زیر طبع) ۲- مقالات شبلی دوم (ادبی)

۳- 〃 سوم (تعلیمی) ۴- 〃 چہارم (تنقیدی)

۵- 〃 پنجم (سوانحی) ۶- 〃 ششم (تاریخی)

۷- مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)

اردو کی حمدیہ شاعری کا جائزہ

از ڈاکٹر محمد اسمٰعیل آزاد فتحپوری

شعر و شاعری کی دو تقسیمیں کی گئی ہیں۔ موضوعاتی اور ہیئتی۔ موضوعاتی تقسیم کے تحت مذہبی شاعری، صوفیانہ شاعری' فلسفیانہ شاعری' اخلاقی شاعری، غزل' قصیدہ' نعت' واسوخت' خمریات' فخریہ' ہجویہ' مرثیہ' وصف وغیرہ اور ہیئتی تقسیم کے تحت مثلث' مربع، مخمس' مسدس' ترجیع بند' ترکیب بند' قطعہ' رباعی وغیرہ شامل ہیں' غزل' قصیدہ' مثنوی وغیرہ میں موضوع کے ساتھ ہیئت کا بھی تعین ہوتا ہے۔ اصناف سخن کی تقسیم درج ذیل طور پر کی جا سکتی ہے۔

(۱) موضوعی ہیئتی اصناف (۲) ہیئتی اصناف (۳) موضوعی اصناف (۴) عوامی و تہذیبی اصناف۔ حمد کی بنیاد موضوع پر ہے اور اس کا شمار موضوعاتی تقسیم کے تحت ہوتا ہے۔ لغوی اعتبار سے حمد کے معنی تعریف ہیں۔ لیکن شعری اصطلاح میں حمد اس صنف سخن کو کہتے ہیں جس کا مطمح فکری اللہ پاک کی ذات اقدس اور اس کے متعلقات و منسلکات ہوں۔ راقم نے اپنی ایک کتاب میں اس صنف کی وسعت کی بابت لکھا ہے کہ "حمد میں بہت وسعت ہے۔ کیونکہ اس میں ہر قسم کے مضامین جو اللہ پاک کی ذات وصفات سے متعلق ہوں بیان کیے جاتے ہیں اور اسی طرح عشق رب اور فنافی اللہ میں طاری ہونے والے جملہ جذبات کی ترجمانی حمد کے ذریعہ کی جاتی ہے"[1]

کلام الٰہی کی دو سورتوں میں حمد کی وسعت کی بات کی گئی ہے:

---

[1] ڈاکٹر محمد اسمٰعیل آزاد فتحپوری' انتخاب حمد و نعت مع مقدمہ صفحہ ۱۱۔

قُلۡ لَّوۡ كَانَ الۡبَحۡرُ مِدَادًا
لِّكَلِمٰتِ رَبِّىۡ لَنَفِدَ الۡبَحۡرُ
قَبۡلَ اَنۡ تَنۡفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّىۡ
وَلَوۡ جِئۡنَا بِمِثۡلِهٖ مَدَدًا ۝
(کہف : ۱۰۹)

کہہ دیجئے کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے
کے لیے سمندر کا پانی روشنائی کی جگہ ہو
تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے
پہلے سمندر ختم ہوجائے گا۔ اگرچہ اس
سمندر کے مثل دوسرا سمندر ہم مدد کے
لیے لے آئیں۔

وَلَوۡ اَنَّ مَا فِى الۡاَرۡضِ مِنۡ شَجَرَةٍ
اَقۡلَامٌ وَّالۡبَحۡرُ يَمُدُّهٗ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ
سَبۡعَةُ اَبۡحُرٍ مَّا نَفِدَتۡ كَلِمٰتُ
اللّٰهِ ۝ (لقمان : ۲۱)

اور جتنے درخت زمین بھر میں ہیں اگر
وہ سب قلم بن جائیں اور یہ جو سمندر
ہیں ان کے علاوہ سات سمندر اور
ہوجائیں تو اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔

ہر زبان و ادب میں اللہ پاک کی حمد سے متعلق شہ پارے کسی نہ کسی صورت میں ضرور ملتے ہیں۔ ہندی ادب میں بالخصوص متقدمین و متوسطین کے عہد میں شعرائے کرام التزاماً حمدیہ اشعار کہتے تھے جنھیں "ایشور وندنا" کہا جاتا ہے۔

مذاہب عالم کی تاریخ شاہد ہے کہ خدا کا تصور کسی نہ کسی صورت میں 'روز الست' سے ہر زمانے میں ہر جگہ اور ہر وقت موجود چلا آرہا ہے۔ عہد عتیق میں افریقہ کے اوجی اور اشانتی قوام میں بھی تصور الہ موجود تھا۔ یبو لوگ خدا کی حمد یوں کرتے تھے "آسمان کے خدا بیماری اور موت سے ہماری حفاظت کر، اے خدا ہمیں خوشی اور دانش عطا کر"۔ عراق کی قدیم بابلی اور آشوری قوموں میں بھی خدا کا تصور پایا جاتا تھا۔ وہ اللہ پاک کی رحمٰن و رحیم صفات سے بخوبی آگاہ تھے جیسا کہ اس دعا سے معلوم ہوتا ہے "میں اپنے رحمدل دیوتا سے رجوع کرتا ہوں۔ اسکی

مدد چاہتا ہوں اور آہیں بھرتا ہوں جو افعال بد میں نے کیے ہیں۔ ہوا انہیں اڑا لے جائے، میرے گناہوں کو کپڑے کی طرح پھاڑ ڈال" قدیم مصر میں "پتاح" کا تصور بھی خدا کے تصور سے قریب ہے۔

قدیم امریکہ کے مذاہب میں بھی خدائے واحد کا تصور پایا جاتا ہے۔ امریکہ کی قدیم انذتیق قوم میں خدا کا یہ تصور تھا کہ وہ اپنی صیقل شدہ ڈھال میں انسانوں کے کل اعمال دیکھتا ہے۔ روح کو قبض کرنے کے لیے وہ تاریک راستوں میں مثل ہوا کے دوڑتا ہے۔ وہ مجیب الدعوات بھی ہے۔ ہندوؤں میں بھی معبود پرستی کا رجحان پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ان کی قدیم ترین مذہبی کتاب "رگ وید" میں "پرجاپتی" کی حمد اس طرح کی گئی ہے:

"پرجاپتی نے کاریگر کی طرح اس عالم کو گھڑا۔ دیوتاؤں کے ابتدائی زمانہ میں لاشئے سے شئے وجود میں آئی" "یجر وید" میں خدا کی حمد اس طرح کی گئی ہے۔ "خدا ایک ہے وہ متحرک ہے تاہم دماغ سے زیادہ سریع السیر ہے۔ حواس اس تک نہیں پہونچ سکتے اگرچہ وہ ان میں ہے" "اتھروید" میں اللہ پاک کے متعلق کہا گیا ہے کہ "ورن آقائے اعلیٰ دیکھتا ہے گویا وہ نزدیک ہو، جب کوئی شخص کھڑا ہوتا یا چلتا ہے یا چھپتا ہے، اگر وہ لیٹے جاتا ہے یا اٹھتا ہے۔ جب دو آدمی پاس بیٹھ کر کانا پھوسی کرتے ہیں تو بھی شاہ ورن کو اس کا علم ہوتا ہے وہ وہاں مثل ثالث کے موجود رہتا ہے اگر کوئی آسمان سے پرے بھاگ کر جانا چاہے تو بھی وہ شاہ ورن سے بچ نہیں سکتا۔ ٹھیک اسی مفہوم کی آیت قرآن مجید میں بھی موجود ہے۔ ملاحظہ ہو:

يٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ اِنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ
اَنۡ تَنۡفُذُوۡا مِنۡ اَقۡطَارِ السَّمٰوٰتِ
وَالۡاَرۡضِ فَانۡفُذُوۡا ؕ لَا تَنۡفُذُوۡنَ

اے گروہ انس و جن! اگر تم اس بات
کی طاقت رکھتے ہو کہ آسمانوں اور زمین
کی سرحدوں سے باہر نکل جاؤ تو نکل جاؤ

اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿ (رحمٰن : ۳۳) تم جہاں بھی جاؤگے وہیں اللہ پاک کی حکومت وجبروت سے سابقہ پڑے گا۔

اگرچہ جین اور بدھ مذاہب خدا کے قائل نہیں ہیں لیکن وہ تیرتھنکر (پیغمبر) کو ہی خدا کے روپ میں پوجتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں یہ دعائیہ کلمات :۔ آقا جیتندر کے سامنے میں اپنا سر عاجزی سے جھکاتا ہوں، جو ساری دنیا کا معبود اور امن و راحت بخشنے والا ہے، ایران کے مانوی مذہب میں اللہ تعالیٰ کی حمد کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

"مانی! اے منور ہستی! تو قابل ستائش ہے، ہمارے ہادی، نور کے سرچشمے، حیات کی شاخ، اے شجر عظیم، جو کہ سراپا شفا ہے۔ میں سجدہ کرتا ہوں اور تمجید کرتا ہے، رب ذوالجلال کی عظیم ہستی کی جو سراپا نور ہے۔"

یہودیوں کے یہاں بھی خدائے واحد کا تصور پایا جاتا ہے۔ یسعیاہ نبی نے خدا کی عظمت کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

"کس نے پانیوں کو اپنے ہاتھ کے چلو سے ناپا اور آسمان کو بالشت سے پیمائش کی اور زمین کی گرد کو پیمانے سے بھرا اور پہاڑوں کو پلڑوں میں ڈال کر وزن کیا۔ دیکھ وہ بحری ممالک کو ایک ذرے کی مانند اٹھوالیتا ہے... ساری قومیں اس کے آگے کوئی چیز نہیں بلکہ وہ اس کے نزدیک بطالت اور ناچیز سے بھی حساب میں کمتر ہیں۔"

عیسائیوں کے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام نے بھی خدا کی وحدت کی دعوت دی۔ چنانچہ یوحنا کے تیسرے باب کی سترہویں آیت میں مرقوم ہے کہ "خدا واحد اور برحق ہے"۔ لوقا میں کہا گیا ہے کہ "کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا"۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی ہر قوم میں خواہ وہ مہذب ہو یا غیر مہذب، خدائے واحد کی

پرستش کے آثار و علائم نمایاں ہیں۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد "آسٹریلیا کے وحشی قبائل سے لے کر تاریخی عہد کے متمدن انسانوں تک کوئی بھی اس (خدا) کے تصور کی امنگ سے خالی نہیں رہا"۔

اسلام نے اللہ کی تحمید و تمجید کا بکثرت حکم دیا ہے، خود قرآن پاک کی ابتدا اللہ پاک کی حمد سے ہوتی ہے، آیت الکرسی، سورۂ حشر کی آخری آیات اور سورۂ اخلاص وغیرہ میں خصوصیت سے اللہ کی تعریف و توصیف بیان کی گئی ہے، مزید برآں قرآن پاک میں متعدد مقامات پر اللہ کی حمد کی گئی ہے۔ "وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ" اور بے شک اللہ غنی اور حمید ہے یعنی تعریف اور حمد اسی کو سزاوار ہے وہ اپنی ذات میں آپ ہی حمد ہے۔ "له الحمد فی الاولی والآخرة" اسی (اللہ) کے لیے حمد ہے دنیا میں بھی آخرت میں بھی۔ "انه حمید مجید" یقیناً اللہ نہایت تعریف والا اور بڑی شان والا ہے۔ "وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ"۔ آسمانوں اور زمینوں میں حمد اسی کے لیے ہے۔ تحمید کا حکم جن آیات میں ہے ان میں سے چند ملاحظہ ہوں :

"وسبح بحمد ربک حین تقوم" تم جب اٹھو تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔ "فسبح بحمد ربک" اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو"۔ احادیث نبویہ میں بھی متعدد جگہوں پر حمد و ثنا کا حکم وارد ہوا ہے۔ مسند احمد اور بخاری میں آیا ہے کہ "لا اله الا الله وحده لا شریک له۔ له الملك وله الحمد وهو علی کل شئی قدیر" سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اکبر ولا حول ولا قوة الا بالله کہتے ہوئے نیند سے بیدار ہو۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ نیند سے بیدار ہونے پر یہ دعا پڑھیں "الحمد لله الذی احیی نفسی بعد ما اماتها والیه النشور"۔

اس تفصیل سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ دنیا کے ہر مقام میں اور ہر زمانے میں اللہ پاک کی تحمید و تقدیس کی جاتی رہی اور جتنی آفاقیت اور عالمگیری حمد میں ہے اتنی کسی اور چیز میں نہیں ہے۔

حمد عالمی ادب کی سب سے مفید اور کارآمد صنف سخن ہے۔ اگر کوئی شخص صرف ایک صنف سے شعر و شاعری کے تمام اشکال و ہئیات سے آگاہی چاہتا ہے تو اس کو یہ آگاہی اسی صنف حمد سے حاصل ہوسکتی ہے۔ حمد کا یہ ایسا امتیازی وصف ہے جس میں نعت کے علاوہ کوئی دوسری صنف سخن اس کی سہیم و شریک نہیں ہے۔

اللہ کی صاحب عظمت و جبروت ہستی کے سامنے جب انسان اپنے کو بے بس اور مجبور محض تصور کرتا ہے تو اس کے دل میں اللہ پاک کی عظمت و بزرگی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اسی عظمت کے ساتھ جب عقیدت کا جذبہ بھی شامل ہوجائے تو پھر اس کی زبان سے اللہ کی بڑائی نکلتی ہے عظمت و عقیدت کا یہی اظہار حمدیہ نغموں اور تمجیدی زمزموں میں پایا جاتا ہے جن سے عالمی ادب کا بیشتر حصہ بھرا پڑا ہے۔ ان نغموں میں اللہ پاک کی مختاری اور انسان کی مجبوری، اللہ پاک کی کارسازی اور انسان کی کوتاہ دستی، اللہ پاک کی چارہ سازی اور انسان کی درماندگی، اللہ پاک کی توصیف اور انسان کی تحقیر کا اظہار ہوتا ہے۔ خدا سے عقیدت و خوف کا ملا جلا جذبہ مہذب اور غیر مہذب دونوں قوموں میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ دور جاہلیت میں بھی حمدیہ اشعار کافی تعداد میں ملتے ہیں۔ اس سلسلہ میں زید بن عمر بن نفیل کا یہ شعر کافی مشہور ہے۔

عبادك يخطئون وانت رب　　　بكفيك المنايا والحتوم

یعنی تو پروردگار ہے۔ سب لوگوں کا بادشاہ ہے۔ موتیں اور فیصلے تیرے ہی قبضہ میں ہیں۔

ورقہ بن نوفل کے حمدیہ اشعار بھلائے نہیں جاسکتے جن میں غیر اللہ کی پرستش سے روکا گیا ہے اور اللہ پاک کی زبردست تحمید و تمجید کی گئی ہے۔

جاہلی شاعر امیہ بن صلت کے حمدیہ اشعار تو اتنے عظیم و فہیم تھے کہ ابوشریدؓ کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سواری میں بطور ردیف بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسی حالت میں

آپ صلعم کو امیہ بن صلت کے سو اشعار سنائے اور آپ ہر شعر پر ارشاد فرماتے تھے کہ اور سناؤ۔

آپ صلعم نے ایک بار حضرت لبیدؓ کے حمدیہ اشعار کی بابت بھی کلمات تحسین استعمال کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ سب سے اچھا کلمہ جو کسی نے بھی کہا ہے وہ لبید کا یہ کلمہ ہے۔ الا کل شئی ما خلا اللہ باطل یعنی خدا کے علاوہ ہر شئی باطل ہے۔

اسلامی عہد کے حمد نگار شعراء میں حضرت حسان بن ثابت انصاریؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ کے اسمائے گرامی کافی اہم ہیں۔ حضرت حسان کے صرف دو اشعار ذیل میں رقم کیے جاتے ہیں۔

تعاليت رب الناس عن قول من دعا　　　سواك الها انت اعلى وامجد

لك الخلق والنعما والامر كله　　　فاياك نستهدى واياك نعبد

ترجمہ:۔ سارے جہاں کے رب! تیری شان بڑی ہے اور تو اس شخص کے قول سے بلند و برتر ہے جو تیرے علاوہ کسی کو پکار رہا ہے۔ حیات بخشی، نفع رسانی اور ساری حکمرانی صرف تیری ہے۔ ہم تجھ ہی سے ہدایت مانگتے ہیں اور تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔

دور نبوی کے بعد کے شعراء میں محمود وراق اور شیخ عمر بن وردی کے حمدیہ اشعار بھی ایک خاص قسم کی تمکنت کے مالک ہیں۔

فارسی کے شعرائے حمد نے حمد کے دامن کو کافی وسیع کیا۔ انہوں نے شاعری کی اس صنف میں اللہ پاک کی ذات و صفات، متعلقات و منسلکات کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے انعامات و اکرامات اور اس کے عالمی عواقب و نتائج پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح حمد میں متصوفانہ خیالات، اخوت، بھائی چارہ، میل ملاپ، امن و آشتی کے پیغامات اور فلسفہ و سائنس کے مفید اضافے کیے گئے۔ فارسی ادب میں فردوسی سے لے کر آج تک کے شعراء نے حمد کا اچھا ذخیرہ تیار کیا۔

شیخ فضل اللہ ابو سعید ابو الخیر نے رباعیات کی شکل میں اچھے حمدیہ اشعار کہے ہیں۔ نظامی نے اپنی حمدوں میں شیریں کلامی اور نزاکت تخییل کو خاصی اہمیت دی۔ اس نے اپنی حمدیہ شاعری میں امت مسلمہ کے ادبار کا نقشہ کافی دلآویز انداز میں کھینچا ہے اور مسلمانوں کی پستی پر آنسو بہائے ہیں سعدی نے سادگی اظہار، ملاحت اور لطافت کو خاصی اہمیت دی ہے۔ جامی نے حمد کو معراج کمال پر پہونچا دیا۔ اس میں مثالی درد اور اثر کا مزاج ڈالا۔ فارسی کے ہندوستانی شعرا نے بھی کافی جاندار حمد لکھی ہیں۔ خسرو نے شاعرانہ توجیہات، عرفی نے مودب انداز بیان اور غالب نے مضمون آفرینی کے ذریعہ حمد میں بیکراں وسعت پیدا کر دی۔

ہندوستان اور عرب کے روابط قدیم زمانہ سے چلے آرہے ہیں۔ نبی امی کی پیدائش سے پیشتر کی عربی شاعری میں ہندوستان کا تذکرہ ملتا ہے۔ اہل عرب کو ہند لفظاً تنام غوب تھا کہ وہ اپنی عورتوں کا نام ہند رکھتے تھے، ابو سفیان کی بیوی کا نام ہندہ تھا۔ کعب ابن زہیر کے قصیدے کے جس شعر پر نبی رحمت ؐ نے شاعر کو اپنی مبارک چادر مرحمت فرمائی تھی اس میں محمدؐ امی صلعم کو ہندوستانی تلوار سے تشبیہ دی گئی ہے۔ لیکن ہندوستانی ادب، عربی و ایرانی ادب سے اس وقت تیزی سے متاثر ہونے لگا جب ان دونوں خطوں کے مسلمانوں نے ہندوستان پر حملے کیے اور یہاں بود و باش اختیار کر لی۔ مسلم صوفیائے کبار نے اصلاحی مشن چلائے اور اللہ پاک کے فرامین وارشادات کو مشعل راہ بنا کر آدمیت کو انسانیت میں بدلنے کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ صوفی دلوں کو سدھارتا ہے وہ ظاہر کے مقابلے میں باطن کو ترجیح دیتا ہے۔ مولوی عبد الحق کے لفظوں میں:

"وہ دلوں کو ٹٹولتا ہے اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ دلوں کی تہ تک پہونچتا ہے، جہاں انسان کے اصل اسرار دبے اور چھپے رہتے ہیں جن سے ہم خود بھی اکثر واقف

نہیں ہوتے ۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ علما، امرا بلکہ حکومتوں اور بادشاہوں سے بھی وہ کام نہیں ہو سکتا جو فقیر اور درویش کر گزرتے ہیں۔ بادشاہوں کا دربار خاص ہوتا ہے اور فقیر کا دربار عام ہے، جہاں بڑے چھوٹے، امیر غریب، عالم جاہل کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ بادشاہ جان و مال کا مالک ہے لیکن فقیر کا قبضہ دلوں پر ہوتا ہے اور اسی لیے ان کا اثر محدود ہوتا ہے اور ان کا بے پایاں۔ یہی سبب ہے کہ درویش کو وہ قوت و اقتدار حاصل ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے جبار و با جبروت بادشاہوں کو بھی اس کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔"[1]

عوام تک اپنی بات پہونچانے کے لیے انہیں عوام کی زبان سیکھنی پڑتی ہے۔ اسی لیے جتنے بھی صوفیائے عظام باہر سے ہندوستان تشریف لائے یا یہیں متولد ہوئے انہیں یہیں کی بولیوں میں عوام سے گفتگو کرنی پڑی، حالانکہ ان میں سے بیشتر کو عربی و فارسی زبانوں میں پوری مہارت حاصل تھی۔ اس نظریہ کی تائید شہادت التحقیق میں ہندی زبان میں اظہار خیال کے سلسلے میں میراں جی کی اس معذرت سے ہوتی ہے کہ انہیں چونکہ عوام کو سمجھانا ہے اس لیے وہ عوام کی زبان میں بات کرتے ہیں جس طرح پھل کے چھلکے کو نہیں مغز کو دیکھا جاتا ہے اسی طرح ان کے کلام کی زبان سے صرف نظر کر کے معانی و مفاہیم پر نظر رکھنی چاہیے۔ مقصد کو اہمیت دینا چاہیے نہ کہ ذریعہ کو۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام اردو زبان کے معماران اول کہے جاتے ہیں۔ ان کو اللہ پاک سے والہانہ شیفتگی اور عقیدت تھی اور اللہ کے دکھائے ہوئے سانچے میں اپنی زندگی ڈھالنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ اللہ والے لوگ عالم انسانیت کو قعر مظلمت سے نکالنے کے لیے علاقائی زبانوں کو ذریعہ ابلاغ و تبلیغ بناتے تھے۔ چنانچہ صوفیائے کرام نے مقامی

---

[1] مولوی عبد الحق: اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ صفحہ ۶ و ۷۔

بولیوں میں اللہ پاک کی تحمید و تقدیس کے نغمے گائے۔ بہمنی دور کے سید محمد حسینی گیسو دراز کے کلام میں توحید کی روح رواں دواں ہے۔ انہوں نے متصوفانہ خیالات کے مابین خالص حمد کے اشعار کہے ہیں۔ ملا داؤد نے اپنی مثنوی چندائن میں حمد الٰہی میں کئی بند کہے ہیں۔ پندرہویں صدی عیسوی کے عہد آفریں شاعر فخر دین نظامی کی شخصیت اردو حمد کی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے حمدیہ اشعار میں قرآنی آیات کو نظم کرکے کلام کے حسن کو دوبالا کیا ہے۔ ان کی تصنیف "کدم راؤ پدم راؤ" مضامین کے ساتھ ساتھ لسانی نقطہ نگاہ سے بھی اہم ہے۔ انہوں نے اپنی مذکورہ السبق تصنیف میں عربی فارسی الفاظ کے بجائے سنسکرت، پراکرت اور علاقائی زبانوں کے الفاظ بکثرت استعمال کیے ہیں۔

شمس العشاق میراں جی نے حمد الٰہی کے لیے تصوف کو ذریعہ بنایا۔ آپ نے تصوف کے رموز و اسرار اور شرعی احکام عوام تک پہونچانے کے لیے سیدھی سادی شاعری میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میراں جی کے انداز بیان میں ادبیت سے زیادہ عوامیت پائی جاتی ہے۔ قدم قدم پر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اپنی بات کو شعر میں بیان کرنے کی بس ایک کوشش کی جارہی ہے جو آج سرسری معلوم ہورہی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ کھودا جارہا ہے اور بہ ہزار دقت راستہ بنایا جارہا ہے۔ اس طرح انہوں نے حی لایموت سے بے علت نفس اپنی نسبت استوار کرنے اور خدائے عزوجل کی معیت بلا علاقہ حاصل کرنے کے لیے اپنے مریدوں اور عامۂ خلائق کو شعری پیرایے میں درس دیے۔ جو خوش نغز، خوش نامۂ شہادت التحقیق، مغز قلوب اور چہار شہادت وغیرہ کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں۔

نظامی کی زبان عوام کی زبان تھی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس مثنوی میں جو زبان استعمال ہوئی ہے اس کا بنیادی ڈھانچہ فاعل، فعل، مفعول کی ترتیب، مصرعوں کی ساخت، ضمائر اور

افعال کا استعمال وہی ہے جو آج بھی اردو زبان کا ہے۔ لیکن نظامی کی حمد مشمولہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کی زبان ثقیل ہے۔ میراں جی نے اپنی حمد سے ثقیل الفاظ کا اخراج کرکے اپنی زبان کو نکھار عطا کیا۔

شاہ برہان الدین جانم کبیر سے متاثر تھے انہوں نے اپنے حمدیہ نغموں میں اس ہستی مطلق خدا کو کائنات کے ذرے ذرے میں جلوہ فرما دیکھا ہے جو واحد و یکتا ہے۔ انہوں نے نظریۂ "ہمہ اوست" کو اشعار میں ڈھالا ہے۔ انہوں نے خدا کی قوت و جبروت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انبیاء علیہم السلام بھی اللہ رب العزت کے سامنے نفسی نفسی کریں گے بھیم جیسا مہابلی بھی اپنی قوت اس کے سامنے کھودے گا اور رام جیسی عظیم ہستی بھی اپنی بے بسی پر اللہ رب العزت کے سامنے رودے گی۔ اس طرح ان کی حمدوں میں ہندوستانی عناصر بکثرت ملتے ہیں۔

اشرف نے حقایق و معارف کی تعلیم ورثے میں پائی تھی اسی لیے انہوں نے اپنی تصانیف میں توحید پر خصوصی توجہ دی ہے۔ موصوف نوسرہار میں کہتے ہیں۔

اشرف لیکھے ابہ بکھان	توحید حق کی موزوں آن
اللہ واحد حق سبحان	جن بہ سرجیا بھومی سمان

فرماں روائے بیدر مرزا علی کے دور میں قریشی بیدری نے جو جنسیات کی ایک مستقل تصنیف "بھوگ بل" کے مصنف ہیں ولایت نامہ میں اللہ پاک کی تحمید و تقدیس میں نئے نئے پہلو نکالے ہیں۔ بھوگ بل پڑھنے والا قاری یقیناً یہ تصنیف پڑھ کر متعجب ہوگا کہ وہی قلم اس طرح کی مذہبی تصنیف کیسے لکھ سکتا ہے۔ قریشی نے اپنی حمد میں اللہ پاک کی صفت خلاقیت ہی کو مدنظر رکھا ہے۔

خوب محمد چشتی نے خدا کے لطیف ہونے پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس بات کا اظہار

کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی فاعل حقیقی اور قادر مطلق ہے۔ کہا گیا ہے کہ "لا تتحرک ذرۃ الا باذن اللہ" یعنی کوئی ذرہ اللہ کی اجازت کے بغیر حرکت نہیں کرتا، اسی حقیقت کو بنیاد بنا کر خوب محمد چشتی نے کہا ہے کہ جتنے اعمال ہیں سب قدرت کی صفات سے پیدا ہوتے ہیں لیکن نفس خودی سے دھوکہ کھا کر سمجھتا ہے کہ کرنے والا وہ ہے۔

شاہ ابوالحسن قادری نے اللہ پاک کی تحمید میں وصفی انداز بیان اپنایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ جو خالق کائنات ہے اس نے امر کن سے کائنات کی تخلیق کی۔ اس کا علم مظاہر کائنات پر محیط ہے۔ عالم کائنات جب عدم کے پردے میں تھا تب بھی اللہ کو اس کا علم تھا۔

عبداللہ قطب شاہ کے دربار کے ملک الشعراء غواصی نے مثنویوں کے علاوہ قصائد میں بھی حمدیہ شاعری کے اچھے نمونے پیش کیے ہیں۔

ابن نشاطی کٹر مذہبی اور راسخ العقیدہ انسان تھا۔ وہ دنیاوی عیش و نشاط کا طالب اور آلام روزگار کی تلخیوں سے حفاظت کا خواہاں تھا۔ وہ خدا سے "ولایت شاعری" بخشش کے طور پر مانگتا ہے تاکہ وہ اشعار کی نزاکت سے نقش بندی کر سکے۔ اس کی مذہبیت میں رسمیت کی بجائے اخلاص و عقیدت جھلکتی ہے۔ اس کے حمدیہ اور مناجاتی اشعار میں خلوص کی گہرائی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ اس نے اپنی ایک حمدیہ کاوش میں لکھا ہے کہ آسمان کی گوہر افشانیاں، چمن کی گلکاریاں، پھولوں کی عطر فشانی اور رنگ آمیزی، نرگس کی کور چشمی، سرو کا سیدھا پن اور باد بہاراں کا الھڑپن، دن رات کی سفیدی اور سیاہی غرض یہ کہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی گواہی دیتی ہے۔

صنعتی نے اپنی حمدیہ کاوش میں خلاق اعظم کی بزرگی، خلاقی خداوندی میں مقام بشریت، انسان کی عظمت اور اس کی دیگر خلائق پر تفوق و برتری بیان کی ہے۔ اس نے اپنی حمدوں میں

آیات و احادیث سے استنباط کیا ہے۔

بلاقی، معظم، مختار اور عبد اللطیف نے اپنی حمدیہ کاوشوں میں وصفی انداز بیان اپناتے ہوئے اللہ پاک کے اسمائے حسنہ پر روشنی ڈالی ہے۔

سرتاج شعراء نصرتی نے حمدیہ اشعار میں اللہ سے عقیدت کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔ اس نے خدا کی نورانی صفت پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ اس نے اپنی مثنوی "علی نامہ" میں بطل و پامردی، شجاعت و دلیری اور ہمت و جوانمردی کو حمدیہ اشعار کا جزء بنایا ہے، اس کی مثنویوں کے دعائیہ حصے بھی لائق اعتناء ہوتے ہیں۔

اردو کی حمدیہ شاعری کا یہ سفر اسی نہج پر چلتا رہا یہاں تک کہ فلک شاعری میں ایک نیا سورج طلوع ہوا۔ راقم الحروف نے اسی سورج کے طلوع ہونے کو حمدیہ تاریخ کی حد فاصل مانا ہے۔ یہ نیا سورج ولی محمد ولی ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں ۱۷۰۰ء کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ وہ سنہ ہے، جب ولی کا دیوان دلی پہونچا اور اس نے اردو شاعری کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ ولی نے شمال و جنوب کے ڈانڈوں کو ملا کر اردو شاعری کو دو آتشہ بنا دیا۔ ولی کے کلیات کا آغاز غزل سے ہوتا ہے جو بیک وقت عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں کی غماز ہے۔ اس نے اس بات کا صاف طور پر اعلان کیا ہے کہ تمام تعریفیں اور حمد اس قادر بے ہمتا کو سزاوار ہیں جو قائم بالذات اور خلاق اعظم ہے اس کی قدرت کاملہ اور حسن تدبیر سے یہ نظام عالم چل رہا ہے۔ اس کا اعتقاد ہے کہ جب باری تعالیٰ اپنی شان ظہوری سے کائنات مدرکہ اور خارجی مظاہر فطرت میں ظہور فرماتا ہے تو اس کی وحدت کثرت میں جلوہ گر ہوتی ہے جو اضافات اور اعتبارات سے ماوراء اور کافی بالذات ہوتی ہے۔ ولی کے یہاں اللہ رب العزت کی ذات والاصفات سے گہری عقیدت اور وارستگی پائی جاتی ہے۔ ولی کے معاصرین اور متاخرین کی فہرست کافی طویل ہے۔

ان شعرا نے اپنی کاوشوں کے ذریعہ اردو ادب میں اپنا مقام بنالیا اور اپنی سخن دانی کا سکہ جما لیا۔

فائز پہلے دہلوی شاعر ہیں جس نے اپنے کلیات میں مندرج اپنے خطبہ میں شاعری کو مذہبی میزان میں تولاہے۔ وہ بادشاہ حقیقی کے سوا دیگر لوگوں کی مدح کے قائل نہ تھے اور علمائے جمہور کی اس رائے سے متفق تھے کہ "شعرے در آں تحمید و تنزیہ باری تعالیٰ باشد یا نعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا غیرے سوائے کان حیاً او میتاً بشرطیکہ راست بود یا نصائح و حکم باشد یا ہجو مشرکانہ جائز است"۔

فائز کے دیوان میں "مناجات" کے عنوان سے جو مثنوی رقم ہے اس میں فائز نے اپنی بیکسی، عاجزی، عصیان اور گنہگاری کا اعتراف کیاہے اور اللہ رب العزت سے اس کے رحم و کرم اور عفو و درگزر کی درخواست کی ہے۔

یوسف بن تاشفین

از مولوی کلیم صفات صاحب اصلاحی

تاریخ و تراجم کی کتابوں میں یوسف بن تاشفین کے حالات نہیں ملتے، ان کی کنیت ابو یعقوب تھی اور وہ ۴۱۰ھ میں پیدا ہوئے تھے[1]۔ افریقہ کے بربری قبیلہ صنہاجہ کی ایک شاخ لمتونہ سے ان کا خاندانی تعلق تھا۔ اس لیے پہلے بربریوں کی ابتدائی تاریخ پر ایک نگاہ ڈال لینی چاہیے۔

شمالی افریقہ اور اندلس کو عرب مغرب کہتے تھے، ان سے پہلے اس پر قرطاجنی، رومی، ونڈل اور دیسی گاتھ اقوام کا قبضہ تھا لیکن مختلف اقوام کی حکمرانی کے باوجود اس ملک کے اصلی باشندوں کے عادات و خصوصیات میں کبھی کسی قسم کا کوئی قابل ذکر تغیر نہیں ہوا۔ یہاں کے یہی اصلی باشندے بربری کہلاتے ہیں۔ ابن خلدون لکھتے ہیں:

"بہت قدیم زمانے سے یہ قوم (بربری) مغرب میں بود و باش رکھتی ہے، پہاڑوں میں، پہاڑ کی سطح زمینوں میں، سواحل پر، شہروں میں، دیہات میں ہر جگہ یہی قوم ہے"[2]۔

موسیو لیبان لکھتا ہے:

"افریقیائے شمالی کو مختلف اوقات میں مختلف اقوام نے فتح کیا ہے اور ان فتوحات کے آثار کم و بیش موجود ہیں، یہ اقوام قرطاجنی، رومی، وینڈل، دیسی گاتھ اور مشرقی تھیں جو عربوں سے پہلے اس پر قابض تھیں، باوجود ان مختلف حکومتوں کے اس ملک کے اصلی باشندوں میں

۱؎ الاعلام زرکلی ج ۳ ص ۸،۱۱ مطبع عربیہ مصر ۱۹۲۸ء ۲؎ تاریخ ابن خلدون ج ۶ ص ۸۹۔

کسی قسم کا تغیر نہیں ہوا، ایک خاص قوم ہے جنھیں بربری کہتے ہیں اور اب تک شہروں سے باہر اپنے مذہب و زبان و رسوم و عادات پر قائم ہیں۔[1]

آگے چل کر لکھتا ہے کہ بربریوں کی قومی تاریخ لکھنا آسان نہیں کیونکہ شمالی افریقہ کے سواحلی باشندے جو کہ سیاہ فام ہیں اور کسی زمانہ میں مختلف اقوام سے مرکب تھے اور دوسرے علاقوں سے آکر یہاں آباد ہوگئے تھے۔ بربریوں کی خالص اور بے میل قوم صرف پہاڑی حصوں میں رہ گئی ہے اور شہروں اور سواحل پر رومیوں، یونانیوں و ینڈل اور بالخصوص عربوں کے میل جول کی وجہ سے ان میں عظیم اختلاط پیدا ہوگیا ہے جس کی وجہ سے سواحلی باشندوں اور اصلی بربری نسل کا لوگوں میں تمیز کرنا سخت مشکل ہے۔ البتہ عربوں اور بربریوں کی شکل و شباہت اور جسمانی ہیئت میں واضح فرق ہے۔ تاہم یہ بات ضرور ہے کہ شہری علاقوں میں یہ قوم مختلف اقوام کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہے۔

مرابطین کا آغاز جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ یوسف بن تاشفین کا خاندانی تعلق افریقہ کے بربری قبیلہ صنہاجہ کی ایک شاخ لمتونہ سے تھا[2] اور اس کی دوسری اہم شاخ جدالہ اور لمطہ ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں اس شاخ کے لوگ یمن سے ہجرت کرکے شام پہونچے اور پھر یہیں سے مصر روانہ ہوگئے۔ اس کے بعد موسیٰ بن نصیر کے ساتھ مغرب میں داخل ہوئے۔ پھر طارق ابن زیاد کے ساتھ طنجہ پر لشکر کشی کی۔ دراصل تاریخ میں ان ہی لوگوں کو مرابطین یا ملثمین کے نام سے جانا جاتا ہے جن کے متعلق ابن خلکان کا بیان یہ ہے:

• ان لوگوں کا تعلق حمیر بن سبا سے ہے جو نہایت بہادر اور جری قوم تھی۔ یہ لوگ جنوبی

[1] تمدن عرب اردو ترجمہ ص ۲۲۰ [2] کتاب المونس فی اخبار افریقہ و تونس، ص ۱۰۱ المطبعۃ الدولۃ التونسیہ ۱۲۸۶ھ۔

صحراؤں میں عربوں کی طرح خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ فقیہ عبداللہ بن تاشفین نے ان کے اندر ملک گیری کا جذبہ پیدا کیا۔ چنانچہ عبداللہ برغواطہ کی مہم میں جب شہید ہوئے تو ان کی جگہ ابوبکر بن عمرو صنہاجی نے لی۔[1][2]

مورخین نے لکھا ہے کہ مرابطین ہمیشہ اپنے چہرے پر لثام باندھتے تھے۔ تاریخوں میں اس کے کئی اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ ایک سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ قبیلۂ حمیر کے سربرآوردہ لوگ گرمی یا سردی کی شدت کی وجہ سے ہمیشہ اپنے چہرے پر لثام باندھتے تھے۔ بعد میں اسی طریقہ کو عوام نے بھی اختیار کرلیا۔ دوسرا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی ہدایت کے مطابق دشمنوں کو دھوکہ دینے اور لٹیروں سے محفوظ رہنے کے لیے اپنے منھ پر نقاب ڈالے رہتے تھے۔ ان کی عورتیں مردوں کے لباس میں گھروں سے باہر نکلتیں اور مرد عورتوں کے لباس میں نقاب لگاکر گھروں میں رہتے تھے۔ چنانچہ جب لٹیرے اور اوباش ان کے گھروں میں لوٹنے کے لیے داخل ہوتے تھے تو عورت سمجھ کر ان سے تعرض نہ کرتے، اس وقت یہ نقاب پوش مرد ان پر ٹوٹ پڑتے اور انہیں قتل کردیتے۔ اس طرح ابتدا میں اپنے دشمنوں پر کامیابی حاصل کرنے کے لیے انھوں نے جو طریقہ اپنایا تھا وہ بعد میں ان کے لیے ایک ضروری عمل بن گیا جسے بابرکت بھی خیال کیا جاتا تھا۔

تذکروں میں ان کی نقاب پوشی کا تیسرا سبب یہ بھی مذکور ہے کہ جب لمتونہ کے قبائل اپنے دشمنوں پر غارت گری کے لیے نکلتے تھے تو ان کے دشمن ان کے مکانوں پر دھاوا بول کر سارا ساز و سامان لوٹ لیتے مگر عورتوں، بچوں اور بوڑھوں سے کوئی تعرض نہ کرتے۔ اس لیے انھوں نے اپنی عورتوں کو بھی مردانہ لباس پہننے اور لثام باندھنے کی تاکید کردی۔ تاکہ مرد و زن کی تمیز نہ ہوسکے۔[3]

[1] یہ یوسف بن تاشفین کے چچازاد بھائی تھے [2] ابن خلکان ج ۳ ص ۴۶۳۔ مطبوعہ مصر ۱۲۹۹ھ [3] ابن اثیر ج ۹ ص ۴۲۸ مطبع بریل لیڈن ۱۸۶۳ء۔

مرابطین کی تحریک کی ابتدا قبیلہ جدالہ کے جوہر نامی شخص حج کے ارادہ سے نکلے تو قیروان میں مشہور عالم و فقیہ ابو عمران الفاسی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ جوہر نے ان سے فرمائش کی کہ صحرائے افریقہ میں ایک معلم کی سخت ضرورت ہے۔ جو اسلامی علوم و عقائد کی تعلیم دے۔ چنانچہ ابو عمران نے اس خدمت کے لیے عبداللہ بن یاسین الکزولی کو ان کے ساتھ کر دیا۔ جو نہایت ذکی، نیک اور فقہ میں ادرک رکھتے تھے۔

جب عبداللہ بن یاسین جوہر کے ہمراہ لمتونہ پہونچے اور اہل قبیلہ کو ان کے آنے کا مقصد معلوم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے اور عبداللہ بن یاسین کا نہایت پُر تپاک خیر مقدم کیا اور ان سے اسلامی تعلیمات و عقائد دریافت کیے۔ عبداللہ بن یاسین نے فرائض و عقائد کی تعلیم دینے کے بعد جب انہیں یہ بتایا کہ "اسلام میں قتل کی سزا قتل، چوری کی سزا قطع ید اور زنا کی سزا رجم ہے تو انہوں نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ کہیں اور جاکر اس کی تبلیغ و اشاعت کریں یہ پابندیاں ہمارے بس کی نہیں ہیں۔

اہل لمتونہ کا یہ رویہ دیکھ کر دونوں حضرات قبیلۂ جدالہ کے پاس آئے اور ان کے سامنے شرعی احکام و قوانین پیش کیے۔ اس قبیلہ کے کچھ لوگوں نے ان کی باتیں مان لیں اور کچھ نے انکار کیا۔ ماننے والوں سے عبداللہ بن یاسین نے کہا کہ تم لوگ اپنے پڑوسی قبائل میں جاکر دینی شرائع و احکام کی تلقین کرو۔ چنانچہ جب وہ لوگ اپنے قبیلوں میں گئے اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کرنی چاہی تو انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ عبداللہ بن یاسین کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے اطاعت شعاروں کو جمع کر کے ان سے کہا کہ اب تم پر منکرین حق سے جہاد کرنا فرض ہو گیا ہے۔ اس لیے تم لوگ اس کے لیے تیار ہو جاؤ اور کسی کو اپنا امیر منتخب کر لو۔ جوہر نے ان سے کہا کہ آپ ہی ہمارے امیر ہیں لیکن عبداللہ بن یاسین نے انکار کیا کہ تمہارے درمیان میری حیثیت

محض حامل شریعت کی ہے البتہ تم امیر ہو سکتے ہو مگر جوہر نے بھی بعض مصالح کی بنا پر ان سے عذر کیا۔ تب کسی قدر بحث و مباحثہ کے بعد ابن یاسین نے ابوبکر بن عمر ولمتونی کو امیر بنایا اور لوگوں سے ان کی بیعت لی اور انہیں امیر المسلمین کا خطاب دیا۔ بیعت کے بعد یہ لوگ جدالہ کے پاس گئے اور اسلام کا پیغام دے کر انہیں بھی جہاد کے لیے اکسایا۔ اس کے بعد یہی لوگ مرابطین کے نام سے مشہور ہو گئے۔[1]

جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اس تحریک کو فروغ حاصل ہوا اور ہزاروں لوگ اس سے وابستہ ہو گئے تو عبداللہ بن یاسین نے تحریک کے مخالفین سے جہاد کی عام اجازت دیدی۔ چنانچہ مرابطین نے سب سے پہلی معرکہ آرائی قبیلۂ گدالہ سے کی۔ جس میں مخالفین کی بہت سی جانیں ضائع ہوئیں اور جو لوگ باقی بچے انہوں نے بھی مرابطین کی دعوت قبول کر لی۔ اس کے بعد دوسرے پڑوسی قبائل سے بھی مرابطین کی پیہم جنگیں ہوتی رہیں اور ان کو فتح و کامرانی حاصل ہوتی رہی اور بڑی تیزی سے ان کی تحریک کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔[2]

سنہ ۴۴۷ھ میں سلجماسہ اور درعہ کے علماء و فقہاء نے اپنے عاملین کی شکایتیں ابن یاسین کے پاس لکھ بھیجیں تو ان کی سرکوبی کے لیے ابن یاسین نے یحییٰ بن عمر ولمتونی کو روانہ کیا انہوں نے ان سے جنگ کر کے کامیابی حاصل کی۔[3]

ان پیہم کامیابیوں کے بعد مرابطین اپنی دعوت کو عام کرنے کے لیے افریقہ کے صحرا سے باہر نکلے یہانتک کہ عیسائیوں سے جنگ کرنے کے لیے اندلس تک پہونچ گئے اور سوس اقصیٰ پر لشکر کشی کی۔ سوس کے امراء نے متفق ہو کر ان کا مقابلہ کیا۔ اس جنگ میں مرابطین کو ناکامی ہوئی۔ اور سنہ ۴۵۱ھ میں ان کی تحریک کے روح رواں ابن یاسین شہید کر دیے گئے۔[4]

۱؎ ابن اثیر ج ۹ ص ۲۴۷ ۲؎ کتاب المونس ص ۱۰۲ و مابعد ۳؎ ایضاً ۴؎ ابن اثیر ج ۹ ص ۴۲۰۔

پھر ابوبکر بن عمر ولمتونی نے جنہیں ابن یاسین اپنی زندگی ہی میں سپہ سالار منتخب کرچکے تھے۔ دو ہزار آدمیوں کو لے کر سوس پر چڑھائی کا ارادہ کیا۔ قسمت کی یاوری سے سوس اور زناتہ سے بارہ ہزار شہسوار ان کے ساتھ ہوگئے۔ اب انہوں نے اہل سوس سے اندلس جانے کا راستہ مانگا مگر انہوں نے انکار کیا۔ ابوبکر نے خدا کی بارگاہ میں دعا کرنے کے بعد ان سے جنگ کی اور انہیں شکست دے کر سلجماسہ تک پہونچے اور ۴۵۳ھ میں سلجماسہ پر ان کا قبضہ ہوگیا۔[1]

یوسف بن تاشفین کی حکومت یوسف بن تاشفین ان ہی ابوبکر بن عمر ولمتونی کے چچازاد بھائی تھے۔ سلجماسہ پر قبضہ کے بعد ابوبکر نے ان کو وہاں اپنا جانشین اور نائب مقرر کیا اور اپنی بیوی زینب کو طلاق دے کر ان کی زوجیت میں کر دیا اور خود صحرا کی مہم پر روانہ ہوگئے۔ ایک دفعہ جب ابوبکر مغرب سے سلجماسہ واپس ہوئے تو اس وقت یوسف بن تاشفین اقتدار پر پوری طرح قابض ہوچکے تھے۔ ابوبکر نے ان سے الجھنا مناسب نہ سمجھا بلکہ اپنی صحرا کی مہم پر پھر روانہ ہوگئے اور بالآخر ۴۸۰ھ میں اسی مہم میں شہید ہوگئے۔[2]

یوسف بن تاشفین کا سلوک اپنی رعایا کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ وہ ان سے زکوٰۃ کے علاوہ کسی طرح کا ٹیکس نہیں لیتے۔ غرض اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے وہ اہل سلجماسہ میں بہت مقبول اور نہایت ہر دلعزیز ہوگئے تھے۔ ان کی قیادت میں مرابطین نے سوس پر چڑھائی کرکے اسے فتح کیا اور پھر سارے بلاد مشرق پر یوسف بن تاشفین کا قبضہ ہوگیا۔

ابوبکر کے انتقال کے بعد مرابطین نے یوسف بن تاشفین کو اپنا بادشاہ منتخب کرکے انہیں امیر المسلمین کا خطاب دیا۔ یوسف بن تاشفین کی سلطنت کی بنیاد دین و شریعت پر قائم ہوئی تھی،

۱؎ ابن اثیر ج ۹ ص ۳۲۷ ۲؎ ابن خلدون ج ۶ ص ۱۸۴۔

اس لیے نہیں دوسرے ممالک اور شہروں کی تسخیر میں زیادہ دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ رعایا کو ان کی عدل پروری اور دینداری کی وجہ سے ان سے نہایت عقیدت و محبت ہوگئی تھی۔

بنو عباد کا دور مرابطین اور بنو عباد کا آخری دور تقریباً ایک ہی ہے اور اندلس میں اصلاً مرابطین کو انہیں سے مزاحمت و مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ اس لیے اس موقع پر بنو عباد کی بھی مختصر تاریخ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

۴۱۴ھ میں ابو القاسم محمد اشبیلیہ کا قاضی اور وزیر مقرر ہوا اور ترقی کرکے خود اشبیلیہ کا حاکم بن بیٹھا۔ اس کے بعد تخت اشبیلیہ پر اس کا بیٹا ابو عمرو متمکن ہوا۔ اس نے قرمونہ، سرنش، ارکش اور مرند کو زیر کرکے اپنی قلمرو میں شامل کرلیا۔ پھر ۴۴۳ھ میں ابو عمرو عباد الملقب بہ معتضد باللہ نے اونبہ اور شلطیش کو بھی فتح کرلیا اور اپنے بیٹے معتمد کو وہاں کی حکومت سپرد کی۔ معتضد نے ۴۴۵ھ میں قرطبہ پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس طرح ابن رشیق سے المریہ، ابن طیغور سے مرتلہ چھین لیا اور رفتہ رفتہ اپنے حدود سلطنت کو بڑی وسعت دی۔ اس طرح بنو عباد کی ایک مستحکم حکومت قائم ہوگئی۔

۴۶۱ھ میں معتضد نے وفات پائی۔ اس کے بیٹے معتمد نے باپ ہی کے نقش قدم پر اپنی سلطنت کو مزید وسیع کیا۔ غرناطہ میں بادیس بن حبوس کی حکومت تھی اور معتضد بادیس کے مابین جنگ کا آغاز بھی ہوچکا تھا۔ تاہم ان دونوں کے درمیان کوئی فیصلہ کن جنگ نہیں ہوئی تھی۔ معتمد نے بادیس کی حکومت پر قبضہ کرکے اس کو بھی زیر نگیں کرلیا۔[1]

مرابطین سے قبل اندلس کی حالت خلیفہ مستظہر کے دور کا سب سے اہم واقعہ

۱؎ تاریخ بنو عباد ج ۲ ص ۱۲۸ و ما بعدا ہیوڈاسی۔ جے بریل ۱۸۵۲ء۔

جنگ صلیبی کا آغاز ہے۔ پانچویں صدی ہجری میں مسلمانوں کی قوت کمزور پڑ گئی تھی، اسپین میں ان کا شیرازہ منتشر ہو رہا تھا۔ سسلی کا جزیرہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اسپین کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں باہم دست وگریباں بھی تھیں اور ایک دوسرے کی رقابت میں عیسائیوں سے مل بھی جایا کرتی تھیں نتیجتاً یورپ کے عیسائیوں نے مسلمانوں کے باہمی اختلاف ورقابت سے خوب فائدہ اٹھایا۔ جن ریاستوں پر مسلمانوں کا قبضہ تھا انہیں بالجبر اپنے حدود حکومت میں شامل کر لیا۔ ان کے پڑوسی ملکوں کے عیسائی فرمانروا اذفونش کا زور اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ خراج وصول کرنے میں بڑی سختی کرتا تھا۔ عیسائی قوموں کو جو خود مسلمانوں کے سایۂ عاطفت میں پل اور بڑھ کر جوان ہوئی تھیں یقین ہو گیا کہ اسپین سے مسلمانوں کے خاتمہ کا وقت قریب آ گیا ہے۔

چنانچہ طلیطلہ کے فرمانروا میں اذفونش سے مقابلہ کی تاب نہ تھی۔ جس کے سبب اہل طلیطلہ نے اس کی اطاعت سے دستبردار ہو کر بطلیموس کے بادشاہ کی اطاعت قبول کر لی، طلیطلہ کے حاکم یحییٰ القادر نے راتوں رات فرار ہو کر اذفونش سے مدد طلب کی تو چند شرائط پر اذفونش نے مدد کا وعدہ کر لیا۔ حاکم طلیطلہ نے گویا تمام شرطیں منظور کر کے عیسائیوں کو اس مسلم سلطنت پر حملہ کرنے اور اس پر قبضہ کرنے کا جواز فراہم کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں ۴۷۳ھ میں یحییٰ القادر نے عیسائیوں سے مل کر طلیطلہ سے جنگ چھیڑ دی۔[1]

اس طرح عیسائیوں کے حوصلے بلند ہوتے رہے اور انہوں نے جزیرہ اندلس میں اس وقت کی سب سے مستحکم حکومت اشبیلیہ کو بھی اپنے ماتحت کرنے کا عزم کر لیا جس پر بنو عباد کے فرمانروا معتمد کی حکومت تھی۔

---

[1] یہ تفصیلات "عبرت نامۂ اندلس" ج ۲ ص ۳۵۶ و ما بعد سے ملخصاً ماخوذ ہیں۔ حالی اکیڈمی، پانی پت ۱۹۳۹ء۔

چنانچہ جب بنو عباد نے اپنے حدود حکومت کو بڑھانا چاہا تو شاہان اندلس خود اس کی راہ راہ میں مزاحم ہوئے اور اس کے مقابلہ میں عیسائیوں کو خراج دینا گوارا کر لیا۔[1]

شاہان اندلس کا یوسف سے مدد کا مطالبہ

بعض یورپین مورخین نے یوسف بن تاشفین پر ملک گیری کی ہوس اور اپنے دائرہ حکومت کی توسیع میں تشدد اور ظلم و بربریت کا الزام لگایا ہے، س، پ اسکاٹ لکھتا ہے:

"ان کے دامن پر بعض عیوب کے دھبے ہیں۔ وہ درویشی کے پردے میں سیاسی بلند نظری کو چھپائے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ انہوں نے اسی پر قناعت نہیں کی کہ اپنے ابن عم کو تاج و تخت سے محروم کر دیں۔ بلکہ انہوں نے ان کی چہیتی بیوی زینب کو بھی اپنے قبضہ میں لے لیا[2]۔۔۔ زینب نے اسی کو غنیمت جانا کہ ان کو ایک چاہنے والا شوہر ملا۔۔۔ چنانچہ وہ بے دھڑک غاصب کے حرم میں چلی گئیں۔ (ہسٹری آف دی مورش ایمپائر ان یورپ اردو ترجمہ ص ۲۰۳)

یہ امر قابل غور ہے کہ شاہان اندلس نے خود مرابطین کے گل سرسبد یوسف بن تاشفین سے عیسائیوں کے مقابلہ کے لیے مدد طلب کی تھی۔ یا یوسف بن تاشفین اندلس پر قبضہ کرنا چاہتے تھے تذکروں میں دونوں بیانات ملتے ہیں۔

راقم کے خیال میں اول الذکر بیان درست معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ اندلس میں اس وقت طوائف الملوکی تھی۔ اس لیے عیسائیوں نے مسلمانوں کے باہمی چیرہ دستیوں کا خوب فائدہ اٹھایا۔ ایسے حالات میں خیر خواہان اندلس کا اسے عیسائیوں کی

---

[1] تاریخ اسلام حصہ سوم ص ۱۲۸ [2] زینب کے متعلق ابن خلدون کا بیان اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ ابوبکر نے خود ہی اپنی بیوی کو طلاق دے کر ان کی زوجیت میں کر دیا تھا۔

بالادستی سے نجات دلانے کی تدبیریں کرنا فطری امر تھا اور ضرورت بھی اس بات کی متقاضی تھی کہ کوئی ایسی بھروسہ کے قابل طاقت ہو جو ان اذیتوں سے ان کی گلوخلاصی کرائے۔ لہذا امرائے اندلس کا آپس میں مشورے کرکے یوسف بن تاشفین کو اندلس میں داخلہ کی دعوت دینا اور ان کی مدد کے لیے بلانا ضروری ہوگیا۔

ذیل میں اس دعوے کی تائید میں معتمد کا وہ خط نقل کیا جاتا ہے جو شاہان اندلس کی طرف سے یوسف بن تاشفین کو بھیجا گیا تھا۔ لیکن اس سے قبل معتمد کی اس مراسلت کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جو یوسف بن تاشفین کو لکھے گئے خط سے پہلے شاہان اندلس سے ہوئی تھی۔

شاہان اندلس کا اندیشہ اور معتمد کا جواب معتمد نے امرائے اندلس کے سامنے بلاد مغرب کے یوسف بن تاشفین سے امداد طلبی کی تجویز پیش کی تو انہوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر یہ بربر ہم پر مسلط ہوئے تو اندلس میں ہماری حفاظت اور مدد کے بجائے خود اس پر قابض ہو جائیں گے اور اندلس کو مزید تباہ و برباد کر ڈالیں گے[1] لیکن معتمد نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ:

" مجھ کو خنزیروں کی پاسبانی سے اونٹوں کی نگہبانی زیادہ پسند ہے"[2]

یوسف بن تاشفین کو معتمد کا خط یوسف بن تاشفین عربی زبان سے ناواقف تھے تاہم اپنی فطری ذہانت و قابلیت سے عربی کا مطلب سمجھ جاتے تھے۔ جب معتمد کا خط ہدایا و تحائف کے ساتھ یوسف بن تاشفین کے پاس پہونچا تو ان کے کاتب نے انہیں پڑھ کر سُنایا۔ خط کا مضمون یہ تھا:

" یہ خط شاہان اندلس کی طرف سے ہے۔ اگر آپ نے ہم کو آباد رہنے دیا تو یہ آپ کی شرافت ہے نہ کہ بے بسی اور اگر ہم نے آپ کا حکم مان لیا تو یہ ہماری عقلمندی ہے نہ کہ وہم لہذا

[1] تاریخ بنی عباد ج ۲ ص ۱۲۳ [2] ابن خلکان ج ۳ ص ۴۵۲۔

ہم نے اپنے لیے بہترین چیز یعنی آپ سے خوشگوار تعلقات قائم کرنے کو پسند کیا ہے۔ آپ بھی ہمارے سلسلے میں بہترین رویہ اپنائیں۔ اس لیے کہ آپ اس مقام پر ہیں جو شرافت ہی کا مقام ہے۔ ہماری بستیوں کو آباد اور باقی رکھنے سے آپ کی سلطنت بھی مزید مستحکم ہوگی"

یوسف بن تاشفین کا جواب ملاحظہ ہو:

" یہ خط یوسف بن تاشفین کی طرف سے ہے۔ تم پر اللہ کی سلامتی اور اس کی رحمت ہو اس شخص کی جانب سے تم کو سلام جو تم سے صلح کر چکا ہے اور معاملات اس نے تمہارے سپرد کر دیے ہیں۔ اس کا فیصلہ تمہارے معاملات کی تائید و نصرت کا ہے۔ تم لوگ اپنے مقبوضات میں خود مختار ہو، ہمارے لیے تم لوگ قابل ترجیح اور مجاز ہو، تم ہماری وفاؤں کا بدلہ اپنی وفاؤں سے دو اور ہماری اخوت کا بدلہ اپنی اخوت سے پیش کرو"[1]

اس خط سے ثابت ہوتا ہے کہ امرائے اندلس یوسف بن تاشفین کی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اس بات کے بھی حق میں تھے کہ اگر ان کو عیسائیوں سے الجھنا پڑا تو وہ یوسف سے ضرور مدد طلب کریں گے۔

معتمد کا اذفونش کے سفراء کا قتل کرنا گو کہ پورے اندلس میں معتمد کی حکومت سب سے بڑی تھی۔ تاہم وہ بھی عیسائی حکومت کو سالانہ خراج دیتا تھا۔ چنانچہ طلیطلہ پر قبضہ کرنے کے بعد اذفونش کے سفراء جب معتمد کے پاس خراج کے لیے گئے اور اس نے مقررہ خراج دینا چاہا تو سفراء نے اسے قبول کرنے کے بجائے معتمد کو ڈرانا اور دھمکانا شروع کیا اور کہا کہ اگر تم اپنے تمام مضبوط قلعے ہمیں حوالہ نہ کروگے تو ہم قرطبہ پر حملہ کرکے اس کو فتح کرلیں گے۔

[1] ابن خلکان ج ۳ ص ۴۵۲۔

معتمد نے ارکان سلطنت اور سپہ سالاروں سے مشورہ کرکے سفراء کو دربار میں بلایا اور قتل کر دیا، لیکن ان میں سے تین آدمیوں نے جو کسی طرح بچ گئے تھے جاکر اذفونش کو حالات سے باخبر کیا۔ اس کے غصہ کی انتہا نہ رہی لیکن وہ علی الفور قرطبہ پر حملہ کرنے کے بجائے سیدھے طلیطلہ چلا گیا تاکہ فوج اور مزید سامان جنگ جمع کرکے منظم طریقے سے قرطبہ پر حملہ کرے۔[1]

اس واقعہ سے عیسائیوں میں تشویش و اضطراب پیدا ہوجانا ناگزیر تھا۔ کیونکہ وہی لوگ جو کل تک اذفونش کو خراج ادا کرتے تھے اب اچانک اس کے سفیروں کو قتل کرنے کی جسارت کر بیٹھے یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ اب ہم تمہاری قوت اور بالادستی سے آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اگر ایک طرف معتمد نے اس غیر معمولی ہمت و جرات سے کام لیا تھا تو دوسری طرف عوام و خواص نہایت خوفزدہ اور سراسیمہ تھے کہ معتمد نے اژدھے کو چھیڑ کر اسے ڈسنے کی دعوت دے دی تھی۔

اس کے بعد معتمد نے شاہ بطلیوس اور شاہ غرناطہ کو لکھا کہ اپنے اپنے قاضیوں کو اس کے پاس بھیج دیں۔ چنانچہ جب تمام قضاۃ اشبیلیہ میں اکٹھا ہوئے تو معتمد نے ان سے کہا کہ میں تم کو یوسف بن تاشفین کے پاس اس لیے بھیجنا چاہتا ہوں کہ ان کے پاس جاکر انہیں ان عیسائیوں سے جہاد کرنے پر آمادہ کرو جو اشبیلیہ پر حملہ کرنے والے ہیں۔[2]

قاضی ابن ادہم یوسف بن تاشفین کے دربار میں

قاضی ابن ادہم معتمد کے اصرار کی وجہ سے جب امیر المسلمین کے پاس گئے جو اس وقت (سبتہ) میں تھے اور ان سے اندلس کے مسلمانوں کی یہ حالت بیان کی کہ وہ اذفونش کے قہر اور اس کے حملہ سے خوفزدہ ہیں تو انہوں نے اپنے ساتھ کی تمام فوجوں کو فوراً اندلس روانہ کر دیا، جب معتمد کو معلوم ہوا کہ یوسف بن تاشفین

[1] ابن اثیر ج ۱۰ ص ۹۲-۹۳ [2] نفح الطیب ج ۲ ص ۵۲۶ علامہ مقریزی۔

نے ہمارے ایلچیوں کے ساتھ حسن لطف و کرم کا معاملہ کیا ہے تو اس نے اشبیلیہ سے ایک جہاز والی سبتہ کے پاس بھیجا کہ وہ یوسف بن تاشفین کے انتظامات کے ساتھ اپنے آپ کو منسلک کر دیں۔

اس کے بعد یوسف بن تاشفین نے اپنی باقی قوموں کو مراکش سے طلب کیا اور انہیں معتمد کے پاس اشبیلیہ جانے کا حکم دیا۔[1] یوسف بن تاشفین کی فوجیں سمندر عبور کرکے جزیرۃ الخضراء میں پہنچ گئیں تو وہاں کے لوگوں نے ان کی پوری مدد کی۔[2]

ادھر معتمد کی بھی ساری افواج جمع ہوگئی تھیں جن سے قرطبہ سے آنے والی فوجیں بھی جا ملیں اور چونکہ پورے اندلس میں یہ شہرت ہوگئی تھی کہ یوسف بن تاشفین جہاد کے لیے آرہے ہیں اس لیے پورے بلاد اندلس سے از خود بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔[3] اذفونش کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بھی اپنی فوجیں اکٹھا کرکے طلیطلہ سے روانہ ہوا اور امیر المسلمین کو خط لکھا تاکہ وہ اس کی فوجوں کی کثرت سے مرعوب ہوجائیں۔ مگر امیر المسلمین نے اس کے خط کی پشت پر "الذی یکون ستراہ" (جو ہوگا اسے تم عنقریب دیکھ لوگے) لکھ کر واپس کر دیا۔ اذفونش اس خط کو پڑھ کر بہت برہم ہوا، ابن خلکان کے بیان کے مطابق یوسف بن تاشفین نے اپنے خط میں اسلامی دستور کے مطابق اذفونش کے سامنے مندرجہ ذیل تین باتیں پیش کی تھیں۔ اسلام[1]، جزیہ[2]، جنگ[3]۔

فتح زلاقہ

اس خط کو دیکھنے بعد اذفونش غصہ سے مخبوط الحواس ہوگیا۔ وہ غضب ناک ہوکر یوسف بن تاشفین کی طرف بڑھا، اس کی تمام افواج بطلیوس میں خیمہ زن ہوگئیں۔ شاہ بطلیوس محمد الافطس نے یوسف بن تاشفین اور معتمد سے ملاقات کی اور ہدایا و سامان رسد بہم پہونچائے۔ یوسف بن تاشفین نے زلاقہ کے میدان سے ۱۲ میل کے فاصلہ پر اپنی فوجیں

[1] ابن اثیر ج ۱۰ ص ۹۹-۱۰۰ [2] نفح الطیب ج ۲ ص ۵۲۶ [3] ایضاً۔

اُتار دیں۔[1]

اذفونش نے معتمد کو خط لکھا کہ جمعہ تمہارا بابرکت دن ہے اور اتوار ہمارا، اس لیے مقابلہ شنبہ کے روز مناسب ہوگا۔ یوسف نے اس تجویز کو منظور کرلیا۔

عیسائیوں کا فریب اذفونش کی تجویز یوسف نے قبول کرلی تھی مگر معتمد کو اس سے اتفاق نہ تھا، اسے پورا یقین تھا کہ عیسائی اسے دھوکہ دینا چاہتے ہیں، اس لیے اس نے سراغ رسانوں کو اس کی فوج کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا۔ جمعہ کے دن علی الصباح اطلاع ملی کہ معاہدے کے برخلاف اذفونش اپنی فوجیں لے کر ان پر آج ہی حملہ کرنے والا ہے۔ معتمد نے یوسف بن تاشفین کو اس کی اطلاع دی تو انہوں نے ایک دستہ کو حکم دیا کہ وہ عیسائیوں کی چھاؤنی میں داخل ہوجائے اور جب اذفونش معتمد سے لڑائی میں مصروف ہوجائے تو وہ اس میں آگ لگادے۔

شروع میں دشمن کی فوج نے معتمد کو گھیر لیا جس سے رؤسائے اندلس کے پائے ثبات میں لغزش آگئی اور اذفونش نے سمجھا کہ شکست خوردہ لوگوں میں یوسف بن تاشفین بھی ہیں۔ مگر امیر المسلمین نے افریقی فوج کے چار ہزار سوار بلائے۔ جن کے پاس گینڈے کے چمڑے کی ڈھالیں، ہندی تلواریں اور زراب کے نیزے تھے، معتمد اور یوسف کی فوجوں نے مل کر اذفونش پر اتنا زبردست حملہ کیا کہ اس کی فوجیں تاب نہ لاسکیں، وہ خود زخمی ہوا۔ نتیجتاً اذفونش کو ذلت آمیز شکست ہوئی۔[2]

---

[1] ابن خلکان ج ۳ ص ۴۵۳ [2] ایضاً ص ۴۵۴، تذکروں میں اس کی پوری تفصیل درج ہے۔ یہاں خلاصہ نقل کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

اس جنگ میں مسلمانوں کی تعداد ۲۰ ہزار[1] اور عیسائیوں کی ۸۰ ہزار[2] تھی۔ دونوں کی تعداد میں کوئی نسبت نہ تھی پھر بھی یوسف بن تاشفین کی حکمت عملی اور حربی کمالات اور معتمد کی ثابت قدمی نے مسلمانوں کو عیسائیوں کی بالادستی سے نجات دلائی اور عیسائیوں کا اندلس پر مکمل قبضہ کا خیال بادر ہوا ہوگیا۔

اندلس میں امیر المسلمین کی مقبولیت گو کہ اس فتح میں معتمد اور امرائے اندلس کی کوششیں بھی شامل تھیں تاہم اس کا اصل سہرا امیر المسلمین کے سر رہا۔ عوام و خواص، علماء و فقہاء سب نے یوسف بن تاشفین کے حربی کمالات کی بنا پر ان کی بڑی پذیرائی کی۔ وہ چونکہ شاہان اندلس کی مدد کے لیے گئے تھے۔ کشور کشائی اور مال غنیمت ان کا مقصد نہیں تھا چنانچہ جب معتمد نے مال غنیمت کی تقسیم کے باب میں ان سے دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ "میں تمہاری مدد کے لیے آیا تھا نہ کہ مال غنیمت حاصل کرنے"۔[3]

اس ایثار، استغناء و بے نیازی نے امیر المسلمین کو شاہان اندلس میں اور زیادہ مقبول بنادیا۔ اس مہم کے بعد وہ خود افریقہ واپس چلے گئے، مگر اپنے مشہور سپہ سالار سیر بن ابوبکر کو تھوڑی فوج کے ساتھ اندلس میں عیسائیوں کی تادیب اور ان سے جہاد کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ چنانچہ چند روز آرام کرنے کے بعد اسلامی فوجیں اذفونش کے علاقوں میں داخل ہوکر لوگوں کو قتل و گرفتار کرنے میں مصروف ہوگئیں۔ جس کے نتیجہ میں متعدد مضبوط قلعے فتح ہوئے اور بہت سارا مال غنیمت ہاتھ آیا جو یوسف بن تاشفین کو بھیجا جاتا رہا۔[4]

مگر افسوس ناک بات یہ ہوئی کہ شاہان اندلس نے اس فتح سے فائدہ اٹھانے کے بجائے

---

[1] تاریخ اسلام حصہ سوم ص ۱۴۴ [2] تاریخ بنی عباد ج ۲ ص ۱۳۳ [3] ابن خلکان ج ۳ ص ۴۵۳
[4] نفح الطیب ج ۲ ص ۵۳۲۔

پھر اپنی پرانی روش دہرانی شروع کی۔ ان کے درمیان کشمکش اور خانہ جنگی ہونے لگی اور وہ عیش و عشرت میں منہمک ہوگئے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر سیر بن ابوبکر نے یوسف بن تاشفین کو خط لکھا:

"ہم نے تو دشمنوں پر خاطر خواہ قابو پالیا ہے اور ان کے دلوں میں ہماری دہشت جاگزیں ہوگئی ہے اور اب جنگ و جدال سے طبیعت بھی اکتا گئی ہے، مگر شاہان اندلس پھر عیش و تنعم میں غرق ہو رہے ہیں۔ اب آپ میرے لیے کیا حکم دیتے ہیں۔"

یوسف بن تاشفین نے جواب دیا:

"کہ اپنی فوجوں کا رخ عیسائیوں کی طرف سے ہٹا کر شاہان اندلس کی طرف موڑ دو کیونکہ پہلے ان کی تادیب لازم ہوگئی ہے۔ جو اطاعت نہ کریں ان کو قید کرکے ان کے علاقوں پر قبضہ کر لو۔ پہلے چھوٹے چھوٹے والیان ملک سے تعرض کرو۔ ابھی معتمد کو نظر انداز کرو جب اور علاقوں پر قبضہ ہو جائے تو ان کی خبر لو۔"[1]

معتمد کی گرفتاری اور موت چنانچہ سب سے پہلے سیر بن ابوبکر نے بنو ہود پر حملہ کیا، یہاں ایک مضبوط قلعہ تھا جس میں خورد و نوش کی اتنی چیزیں مہیا تھیں جو مدت مدید کے لیے کافی تھیں، اس پر قبضہ کے بعد بنو طاہر کی طرف بڑھے جو مشرقی اندلس کے حکمراں تھے۔ اس کو زیر نگیں کرنے کے بعد بنو صمادح کے شہر مریہ پر حملہ آور ہوئے۔ اس کے بعد بطلیوس کو زیر کیا اور عمر بن الافطس کا محاصرہ کرکے ان کو قید کر لیا اور ان کے تمام مقبوضات پر قبضہ کر لیا۔ اپنی ان کارروائیوں کی اطلاع یوسف بن تاشفین کو دیتے ہوئے لکھا کہ معتمد کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ یوسف نے ان کو لکھا:

[1] ابن خلکان ج ۳ ص ۴۵۸۔

"معتمد سے کہو کہ وہ مع اہل و عیال صحرا کی طرف نکل جائیں۔ اگر مان لیں تو ٹھیک ہے ورنہ ان کو بھی قید کر لو۔"[1]

چنانچہ سیر بن ابوبکر نے معتمد سے ملاقات کرکے انہیں سلطان کے حکم سے باخبر کیا۔ معتمد نے خاموشی اختیار کی۔ بالآخر سیر نے اشبیلیہ کا محاصرہ کرکے معتمد کو ان کے اہل و عیال کے ساتھ اغمات بھیج دیا۔ جہاں وہ قید کی حالت میں ۴۸۸ھ میں فوت ہوگیا۔[2]

ابن خلدون کا بیان ہے کہ:

"علمائے اندلس نے فتویٰ دیا تھا کہ معتمد اور دوسرے شاہان اندلس کو ان کے مقبوضات یعنی سلطنتوں سے دستبردار کر دینا اور اگر نہ مانیں تو ان سے جنگ کرنا جائز ہے۔ اسی وجہ سے یوسف نے ان کو قید کرنے کا حکم دیا تھا اور اس طرح اشبیلیہ پر بھی مرابطین کو تسلط حاصل ہوگیا۔"[3]

اندلس پر مکمل قبضہ اس طرح ۴۸۴ھ میں تمام اسلامی اندلس پر یوسف بن تاشفین کا مکمل قبضہ ہوگیا اور ان کی طرف سے وزیر اور گورنر مقرر کر دیے گئے۔[4]

صرف سرقسطہ پر مستعین بن ہود کی حکومت کو یوسف نے بحال رہنے دیا اور اپنے بیٹے کو وصیت کی کہ ان سے کبھی تعرض نہ کرنا کیونکہ اس کے حاکم کی شجاعت و بہادری کی مثالیں دی جاتی ہیں۔[5]

خطاب و خلعت کا مطالبہ مغرب و اندلس پر قبضہ کے بعد اہل الرائے نے یوسف بن تاشفین کو مشورہ دیا کہ خلافت بغداد سے بلاد اندلس اور مغرب کی حکومت کا

[1] ابن خلکان ج ۳ ص ۴۷۶، [2] ابن اثیر ج ۱۰ ص ۱۷۰، [3] ابن خلدون ج ۶ ص ۱۸۰، [4] ابن اثیر ج ۱۰ ص ۱۲۸، [5] ایضاً ص ۱۲۹۔

وثیقہ منگالیں۔ چنانچہ یوسف بن تاشفین نے حسب مشورہ اس عہد کے خلیفۂ بغداد مستنصر کے پاس دو افراد[1] کو ہدایا و تحائف دے کر بھیجا اور خط میں فرنگیوں سے اندلس حاصل کرنے کا ذکر بھی کیا۔[2]

یہ لوگ مستنصر کے پاس جاکر ان سے مغرب و اندلس پر یوسف بن تاشفین کی حکومت کا وثیقہ لے آئے اور عباسی خلیفہ نے انہیں خطاب و خلعت سے بھی سرفراز کیا۔[3]

غزالی اور طرطوشی کی ہدایت اس وقت کے علمائے مشرق میں امام غزالی اور طرطوشی زیادہ شہرت کے حامل تھے۔ ان دونوں بزرگوں نے یوسف بن تاشفین کو خط لکھ کر ہدایت کی کہ وہ عدل و انصاف کو اپنی حکومت کا شعار بنائیں اور ملوک الطوائف کے باب میں خدا کے حکم کو ملحوظ رکھیں۔[4]

امام غزالی کو یوسف بن تاشفین سے خاص تعلق ہوگیا تھا۔ چنانچہ جب انہوں نے اسکندریہ کا قصد کیا تو ان کے پروگرام میں یوسف بن تاشفین سے ملاقات بھی شامل تھی مگر راستہ ہی میں سلطان کی موت کی خبر موصول ہوئی اس لیے تمنائے ملاقات بر نہ آئی۔[5]

امیر المسلمین کے نام کا سکہ اور خطبہ خطاب و خلعت ملنے کے بعد امیر المسلمین نے اپنے نام کا سکہ جاری کیا جس پر کلمۂ توحید نقش تھا[6] اور ہر جمعہ کو تقریباً تین لاکھ جامع مسجدوں میں ان کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔[7]

---

۱ ابن خلدون نے ان کا نام عبداللہ محمد المعامی اشبیلی اور قاضی ابوبکر تحریر کیا ہے۔ ج ۶ ص ۱۸۸
۲ ابن اثیر ج ۱۰ ص ۱۸۸ ۳ ابن خلدون ج ۶ ص ۱۸۸ ۴ ایضاً ۵ ابن خلکان ج ۳ ص ۴۷۰ ۶ الغزالی علامہ شبلی نعمانی ص ۲۱ جدید ایڈیشن ۷ کتاب المونس ص ۱۰۵ ۸ اخبار اندلس ج ۲ ص ۲۵۰ (اردو ترجمہ)

یوسف بن تاشفین کی علم نوازی اندلس پر امیر یوسف بن تاشفین کے قبضہ کے بعد جزیرہ کے بڑے بڑے علما و فضلا ان کے پاس آنے لگے تھے۔ اسی کی وجہ سے ان کا دربار عباسیوں کے ابتدائی دور کے مشابہ ہوگیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے اور ان کے لڑکے علی بن یوسف کے دربار میں جس قدر بڑے بڑے نامور کاتب انشا پرداز اور اہل علم جمع ہوگئے تھے۔ اتنے کسی زمانے میں اور کہیں ایک جگہ نہیں جمع ہوئے تھے۔ مشہور فلسفی ابن طفیل اس کا خاص درباری عالم تھا۔ اس نے مختلف گوشوں کے علمار کو یوسف کے دربار سے متوسل کر دیا تھا۔ مشہور فلسفی و فاضل ابن رشد کی جانب بھی اس کی توجہ ابن طفیل ہی نے مبذول کرائی تھی۔[1]

انتقال بالآخر ۵۰۰ھ میں اندلس کے اس معمار ثانی یوسف بن تاشفین کا انتقال ہوگیا۔[2]

ذاتی اوصاف و کمالات یوسف بن تاشفین زہد و ورع اور دینداری کے ساتھ شجاعت و بہادری میں علانیہ ممتاز اور بے نظیر تھے۔ عفو و درگزر، شرافت و مروت، فیاضی اور جذبہ انفاق ان کی سرشت میں داخل تھا۔ وہ لوگوں کی بڑی بڑی خطائیں معاف کر دیتے تھے۔

علمار کی قدردانی امیر یوسف بن تاشفین اصحاب علم و فقہ کے بڑے قدردان تھے اور برابر ان سے استفادہ اور مشورے کرتے رہتے تھے۔ حکومت کا کوئی اہم کام ان کے مشورے کے بغیر انجام نہیں دیتے تھے۔ ان کی کامیابیوں میں ان کی ذاتی تدبیر و سیاست کے علاوہ علما و مدبرین کے صلاح و مشورہ کا بھی بڑا دخل ہوتا تھا۔ ابن اثیر کا بیان ہے:

"یوسف بن تاشفین علماء و فقہار کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ممالک محروسہ میں انہیں حاکم مقرر کرتے تھے۔"[3]

---

۱ اسلام اور عربی تمدن ص ۲۷۲ معارف پریس، ۱۹۵۲ء ۲ الاعلام ج ۳ ص ۱۱۷۸ ۳ ابن اثیر ج ۱۰ ص ۲۸۸۔

معارف کی ڈاک

(۱)

حبیب منزل، علی گڑھ

یکم مارچ ۱۹۹۹ء

مکرمی و محترمی! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

نومبر ۱۹۹۸ء کے معارف میں جناب محمد حامد علی صاحب گورکھپوری نے جناب بہار الحق رضوی کے ابونواس سے متعلق مقالے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "ابونواس کی پیدائش اور موت کی تاریخوں کا صحیح تعین نہیں ہو سکا"، کشمیر یونیورسٹی کے ایک طالب علم ڈاکٹر شاد حسین نے ۱۹۸۵ء میں میری نگرانی میں ابونواس کی زندگی اور شاعری پر بزبان عربی ایم۔ فل کے لیے مقالہ لکھا تھا جو ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ اس میں انھوں نے ابونواس کی پیدائش اور موت کی تاریخوں کے تعین کی کوشش بہت جستجو اور دیدہ وری سے کی تھی۔ انھوں نے ایک جدول بناکر بعض اہم اور ثقہ قدیم و جدید مورخین ادب کی اس بارے میں آرا نقل کی تھیں۔ ان مورخین ادب میں ابن المعتز، ابن خلکان، الجاحظ، بروکلمان، الزرکلی، جرجی زیدان، حسن الزیات، کلیمنٹ ہوارٹ اور نکلسن جیسے معروف نام شامل تھے۔

اس جدول کے مطابق ابونواس کی پیدائش کے سال کی بابت ۱۳۰ھ سے ۱۴۶ھ تک کی روایات ملتی ہیں اور وفات کے سال کی بابت ۱۹۳ھ سے ۲۰۰ھ تک کی۔ لیکن ان کی اپنی تحقیق یہ ہے کہ چونکہ ابونواس نے خلیفہ الامین (م ۱۹۸ھ) کا مرثیہ لکھا ہے اور الامین کی وفات کے بعد ابونواس زیادہ مدت تک زندہ نہیں رہا۔ اس لیے اس کی موت

۱۹۹ھ میں مرجح ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر شاد حسین نے تحریر کیا ہے کہ مورخین ادب کا اس پر اجماع ہے کہ ابونواس کی عمر ۵۹ سال ہوئی۔ اس طرح اس کی پیدائش کا سال ۱۴۱ھ متعین ہو جاتا ہے۔

خلیفہ الامین کے قتل پر ابونواس کے مرثیے کا حوالہ جناب بہار الحق رضوی نے بھی اپنے گراں قدر مقالے (مطبوعہ معارف، اکتوبر ۱۹۹۸ء) میں دیا ہے۔ لیکن ابونواس کی عمر تیقن کے ساتھ ذکر کرکے اس کی ولادت و وفات کے سنین وہ اس طرح معین نہیں کر سکے ہیں جس طرح ڈاکٹر شاد حسین نے کیے ہیں۔ امید کہ یہ معروضات محمد حامد علی صاحب کے لیے باعث تشفی ہوں گی۔

نیاز مند: ریاض الرحمن شروانی

(۲)

دعوت نگر، ابو الفضل انکلیو، نئی دہلی

محترم و مکرم! السلام علیکم

مزاج گرامی؟ دینی مدارس کا قیام و انصرام ملت اسلامیہ کی اہم خدمت ہے۔ یتیم خانے بھی ان کا ایک حصہ ہیں، جو لوگ ان کی سرپرستی فرماتے ہیں وہ قابل مبارکباد ہیں۔ اگر یہ یتیم خانہ کے بجائے "بچوں کا گھر" وغیرہ ناموں سے موسوم کیے جائیں تو یتیموں کو یتیمی کا احساس نہ ہوگا یا کم ہوگا۔

یہ ادارے اگر خود مالی وسائل پیدا کر لیں تو ان سے وابستہ لوگوں میں عزت نفس کا احساس پیدا ہوگا۔

یہ المیہ ہے کہ جو ماہ مقدس روزہ، نماز، تلاوت اور اذکار کے لیے یکسوئی اور فراغت کا طالب ہوتا ہے اس میں سفر کی وجہ سے روزے قضا ہوتے ہیں، باجماعت نماز اور تراویح کا التزام نہیں ہوتا۔ اگر منتظمین کی یاد دہانی سے معاونین خود رقوم ارسال کردیں یا رمضان میں نکالی گئی زکوٰۃ کی وصولی شوال میں ہو تو رمضان کو روزوں اور عبادت کے لیے فارغ کیا جا سکتا ہے۔

والسلام

نیاز مند: عبدالحق فلاحی

وفیات

جناب حیات اللہ انصاری

افسوس ہے کہ ۱۸ر فروری کو جناب حیات اللہ انصاری کا انتقال ہوگیا، وہ مشہور صحافی، ادیب، افسانہ نگار اور اردو تحریک کے رہنما تھے، ۱۹۱۱ء میں ان کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی، فرنگی محل کے مشہور علمی و دینی خانوادے سے ان کا تعلق تھا، یہیں کے مدرسہ نظامیہ میں فارسی و عربی پڑھی اور دینیات کی تکمیل کی، اپنے والد مولانا وحید اللہ کے انتقال کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضل ادب کیا، انٹرنس پاس کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور بی۔ اے کیا۔

۳۷ء میں کانگریس کا ہفت روزہ اخبار "ہندوستان" ان کی ادبی و صحافتی سرگرمیوں کی جولان گاہ بنا۔ اب تو اس کا نام بھی کم ہی لوگ جانتے ہیں، لیکن اس وقت کے اکثر ممتاز ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات اس میں چھپتی تھیں، یہ ۱۹۴۲ء کے ہنگامی دور میں بند ہوگیا اور ۱۹۴۵ء میں "قومی آواز" جاری ہوا تو اس کی ادارت حیات اللہ صاحب نے اس طرح سنبھالی کہ وہ اور قومی آواز لازم و ملزوم سمجھے جانے لگے، وہ اس کے بانی مدیر تھے، انہوں نے اس کا معیار و وقار بہت بلند کیا اور اس کے لیے بڑی قربانیاں دیں، اس کے ذریعہ انہوں نے اردو اور مسلمانوں کی مذہبی و ثقافتی خدمت انجام دی اور ہندو مسلم فرقہ پرستی کے خلاف لڑائی بھی لڑی۔ قومی آواز کی بدولت بہت سے لوگ اچھے صحافی بن گئے، ۳۰ برس بعد ۷۵ء میں وہ ریٹائر ہوئے، ان کے بعد بھی یہ اخبار نکلتا رہا، مگر اب ساقی تو موجود ہیں لیکن آں قدح بشکست۔ قومی آواز سے الگ ہونے کے بعد بھی ان کو صحافت کا چسکا لگا رہا، کچھ عرصہ تک دہلی سے ہفت روزہ "سب ساتھ" نکالا۔

اردو شروع ہی سے ان کی دلچسپی اور سرگرمی کا محور رہی، وہ زندگی بھر اس کے فروغ، اس کی ترقی اور تعلیم و اشاعت کے لیے جدوجہد کرتے رہے، علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں انہوں نے اردو میں تقریر کی مہم چلائی۔ اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے قیام اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل میں ان کا حصہ رہا، ۴۷ء کے بعد اردو پر بڑا سخت

وقت آیا، اس زمانے میں قاضی عبدالغفار اور قاضی محمد عدیل عباسی کے دوش بدوش وہ بھی اردو کی قانونی اور دستوری لڑائی لڑنے کے لیے اس کے ہراول دستہ میں شامل رہے۔ آزادی سے پہلے پرانے لکھنؤ میں زور شور سے "تعلیم بالغان" کا کام شروع کیا اور آزادی کے بعد بالغوں کو دس روز میں اردو لکھنا پڑھنا سکھانے کے لیے حیات اللہ قاعدہ یعنی "دس دن میں اردو" تیار کیا، اسی سلسلے میں "دس دن میں ہندی" بھی لکھی۔ اس سے اردو والوں کو ہندی سیکھنے میں بڑی آسانی ہوئی۔

حیات اللہ صاحب نے کچھ عرصہ گاندھی جی کے ساتھ سیوا گرام آشرم میں گزارا، وہاں بھی لوگوں کو اردو تعلیم دی، گاندھی جی کی واردھا اسکیم کے تحت اردو لیٹرسی تحریک کی بنیاد رکھی تاکہ کم وقت اور کم پیسے میں گھر گھر میں اردو کا رواج ہو۔ پرائمری اسکولوں میں اردو پڑھانے کا سلسلہ بند کر دیا گیا تو انہوں نے ایک ہزار سے زیادہ مقدمے قائم کئے، اس کی وجہ سے پھر ان میں اردو پڑھائی جانے لگی۔ پرائمری سے ایم۔ اے تک اردو نصاب تیار کرنے اور اردو ٹرینڈ ٹیچر کی کمی پوری کرنے کے لئے بھی ان کی کوششیں بار آور ہوئیں۔

مرکزی و ریاستی انجمن ترقی اردو سے ان کا خاص تعلق تھا، ریاستی انجمن تو ان کی اور ان کی بیگم سلطانہ حیات ہی کی نسبت سے جانی جاتی تھی، وہ مرکزی حکومت کے ترقی اردو بورڈ کے چیرمین بھی رہے، اتر پردیش میں اردو کو علاقائی زبان تسلیم کرانے کے لئے انہوں نے دستخطی مہم چلائی اور ۲۰ لاکھ دستخط جمع کر کے صدر جمہوریہ کو پیش کیا۔

ان کے افسانے برصغیر کے معیاری رسالوں میں چھپتے تھے جن کے کئی مجموعے شایع ہوئے، ان کے ناول بھی مقبول ہوئے "لہو کے پھول" ان کا بڑا ضخیم ناول ہے۔ ان کو ان کی گوناگوں خدمات کی بنا پر مختلف اعزاز بھی عطا کئے گئے، حال ہی میں ہریانہ اردو اکادمی نے ایک لاکھ روپے پر مشتمل "حالی ایوارڈ" دیا تھا۔

سیاست ان کی گھٹی میں داخل تھی، آزادی کی تحریک اور کانگریس سے ان کی عملی وابستگی تھی، رفیع احمد قدوائی،

جواہر لال نہرو اور گاندھی جی سے بڑے قریب تھے، نیشنلزم، سوشلزم اور گاندھیائی تصورات کی ان پر گہری چھاپ تھی اور وہ عمر بھر ان نظریات کی تبلیغ کرتے رہے، کئی برس تک یوپی لیجسلیٹو کونسل کے اور دوبار راجیہ سبھا کے ممبر رہے، کئی ملکوں کا سفر بھی کیا۔

وہ ایک مذہبی گھرانے کے فرد تھے اور مذہبی تعلیم بھی حاصل کی تھی، ان کی تحریروں کے منطقیانہ انداز اور طریقۂ استدلال سے بھی معقولات کے اچھے فاضل ہونے کا پتہ چلتا ہے، لیکن شروع میں ان کا رجحان کمیونزم کی طرف ہو گیا تھا اور وہ مذہب سے بھی برگشتہ ہو گئے تھے، بعد میں کمیونزم سے منحرف اور خدا کے قائل ہو گئے تھے مگر اس وقت بھی نیشنلزم اور گاندھی جی کے افکار ان کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے، مذہبی جماعتوں خصوصاً جماعتِ اسلامی کے شدید مخالف تھے، متعدد ممتاز علماء سے ان کا ہمیشہ اختلاف رہا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی سے اکثر نوک جھونک رہتی، حیات اللہ صاحب کے ناول "لہو کے پھول" خصوصاً اس کی ضخامت پر مولانا کا تبصرہ اور قومی آواز سے ان کے ریٹائر ہونے پر مولانا کا نوٹ اب بھی لوگوں کے ذہن میں ہوگا جس کا عنوان یہ مصرعہ تھا:

لذتِ عشق گئی غیر کے مر جانے سے

حیات اللہ صاحب لکھنؤ کے دلکش تہذیبی رکھ رکھاؤ کا نمونہ تھے، ہمیشہ لکھنوی لباس زیب تن ہوتا تھا، لیکن لکھنؤ کی شاعری کے زیادہ معتقد نہیں تھے، البتہ میر انیس کا لوہا مانتے تھے، یہاں کی مشہور "شیعہ سنی کشمکش" سے ان کا کوئی واسطہ نہ تھا، وہ دونوں فرقوں کے اکابر کا احترام کرتے تھے اور دونوں کی تقریبات میں مدعو کئے جاتے تھے۔

مرحوم بڑے اچھے صحافی اور بہت مشاق اہل قلم تھے، اس کا اور ان کی طویل اردو خدمات کا اعتراف ان کے مخالفین کو بھی تھا۔ ان کی وفات اردو دنیا کا بڑا سانحہ ہے، دارالمصنفین اور شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم سے ان کا بڑا تعلق تھا۔ اللہ تعالیٰ ان سے لطف و کرم کا معاملہ کرے۔ آمین!!

"ض"

مطبوعات جدیدہ

خود نوشت حیات سرسید

از جناب ضیاء الدین لاہوری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۳۰۳، قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ: فضلی بک سپر مارکیٹ، ہم بابا پارسی بلڈنگ، اردو بازار، کراچی، پاکستان۔

اس کتاب کی تالیف کا ایک سبب تو یہ بتایا گیا ہے کہ نظریہ پاکستان سرسید کے فکر کا نتیجہ ہونے کے باوجود وہاں ان کی شخصیت و حیات کے مطالعہ پر کما حقہ توجہ نہیں دی گئی لیکن فاضل مولف کے نزدیک اس سے بھی اہم سبب یہ ہے کہ سرسید کے متعلق عموماً تصویر کا صرف ایک رخ پیش نظر رہا اور اصل حقیقت، مداحی و تنقیص کے درمیان مخفی رہی، چنانچہ حقیقت کی جستجو اس کتاب کا اصل مقصد ہے، خود نوشت کے عنوان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سرسید کی اپنی مستقل تصنیف ہے جبکہ اصلاً یہ مولف کی بیس پچیس سال کی محنت و کاوش اور وسیع مطالعہ کا ثمرہ ہے، جنھوں نے سرسید کی تحریروں سے بکھرے موتی چن چن کر اس سلیقہ و مہارت سے پروئے کہ ایک مربوط و جامع سوانح عمری مرتب ہو گئی، اس انوکھے تجربے کے پس پشت یہ جذبہ کار فرما رہا کہ "دوسروں کی توجیہات کے رحم و کرم پر پڑے رہنے کی بجائے خود سرسید کی زبانی ان کے مشن کی صحیح معلومات اور جامع و مستند حوالہ جات کی کتاب میسر آجائے"۔ یقیناً منفرد ہونے کے باوجود یہ تجربہ بڑا کامیاب ہے، سرسید کی زندگی کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے اس جدید حیات جاوید سے زیادہ معتبر و مستند مصدر اور کیا ہو سکتا ہے، فاضل مولف کو مطالعات سرسید میں درجہ تخصص حاصل ہے، مقدمہ سے اس کا اندازہ ہوتا ہے انھوں نے پاکستان اور برطانیہ

کے اہم کتب خانوں میں اصل مصادر و ماخذ تک رسائی حاصل کی اور برسوں کی محنت کے بعد صداقت و غیر جانب داری سے اس کتاب کی شکل میں ایک صاف شفاف آئینہ پیش کر دیا۔ سرسید کی تصانیف کے سرورق کے عکس اور بعض نادر تصویروں سے بھی کتاب مزین ہے۔

اطباء اور ان کی مسیحائی از جناب حکیم محمد مختار اصلاحی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۱۲، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: اصلاحی دواخانہ، فیضی محل، محمد علی روڈ، ممبئی ۳۔۔۔۔۔۴۔

اصلاحی دواخانہ کے بانی و مالک جناب حکیم محمد مختار اصلاحی کا شمار ملک کے ان اطباء میں ہوتا ہے جن کو فن کی مہارت کے علاوہ طبی موضوعات پر تحریر کا عمدہ سلیقہ حاصل ہے، قریباً نصف صدی سے ان کا قلم علم طب کی اشاعت کے لئے وقف ہے، عرصہ ہوا انہوں نے ہفتہ وار بلٹز کے لئے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا تھا جس کا مقصد جدید نسل کو طب مشرق کی اہمیت اور اطبائے سلف کے کارناموں سے روشناس کرانا تھا۔ آسان سادہ اور شگفتہ زبان میں ان کی یہ تحریریں قدر کی نظر سے دیکھی گئیں، زیر نظر کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جس میں گو بقراط، افلاطون، ارسطو، جالینوس، بختیشوع، طبری، رازی اور ابن سینا و زہراوی جیسے متقدمین ائمۂ طب کا ذکر بھی ہے لیکن زیادہ حصہ ہندوستانی اطباء اور ان کے کارناموں پر مشتمل ہے، دہلی، لکھنؤ، ٹونک اور رامپور وغیرہ کے مشاہیر اطباء کی شخصیت، علم و فضل اور ان کی خدمات و مہارت کی انہوں نے بڑی دلکش تصویر کشی کی ہے، بعض امراض میں ان کے نسخوں کو بھی نقل کیا ہے لیکن ان سے بھی زیادہ نفع بخش وہ حکیمانہ اقوال ہیں جو اس کتاب کے صفحات پر جابجا بکھرے ہیں، مسیح الملک حکیم اجمل خاں دہلوی کا تذکرہ قدرتاً زیادہ تفصیل سے ہے، بعض اطباء کے اسماء کے ساتھ ان کی خاص صفت کا ذکر

حکیم صاحب کی نباضی کا عمدہ نمونہ ہے، مثلاً حکیم محمد اسمٰعیل لکھنوی خوش بخت و خوش علاج، حکیم حافظ عبد العلی نوابی ٹھاٹھ کا مطب، حکیم عبد اللطیف فلسفی اور ان کا طرحدار مطب، حکیم عبد الحمید دہلوی سفینۂ طب کا باخبر ناخدا، حکیم محمد سعید دہلوی طبی دنیا کا مجاہد اور شہرۂ آفاق معالج وغیرہ، حکیم سید عبد الحی حسنی کے متعلق ان کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ وہ طب میں درجہ بلند پر فائز اور تشخیص و نسخہ نویسی میں نامور اساتذہ کے کامل متبع تھے لیکن حیات عبد الحی میں اس پہلو سے کم روشنی ڈالی گئی ہے، آخر میں خود صاحب کتاب کے بعض مجربات بیان کیے گئے ہیں۔

علی گڑھ سے دیوبند تک (تعلیمی سفرنامہ) از جناب پروفیسر اکبر رحمانی، متوسط تقطیع، کاغذ و کتابت و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۷۶، قیمت ۶۰ روپے، پتہ: ایجوکیشنل اکادمی، اسلام پورہ، جلگاؤں ۴۲۵۰۰۱، مہاراشٹر۔

چند سال قبل یوپی میں تعلیمی بیداری عام کرنے کی غرض سے جناب سید حامد کی رہنمائی میں ایک کارواں سرگرم سفر ہوا، اس کے حدی خوانوں میں پروفیسر اکبر رحمانی بھی تھے، جنھوں نے اپنی ریاست مہاراشٹر میں تعلیمی منازل سر کرنے کے لئے کئی ہفت خواں طے کئے ہیں، ان کا تجربہ و عمل یوپی کے کارواں کو متحرک رکھنے میں خاصا معاون ثابت ہوا، اب انہوں نے اس کی یادوں کو سپرد قلم کیا ہے جو یہاں کے مسلمانوں کی زبوں حالی، نا اتفاقی، بے حسی اور بگن کی کمی کا نوحہ ہے، کہیں کہیں ان میں حیات کی رمق اور بیداری کی خوش آیند نوید بھی ہے، علی گڑھ سے دیوبند کی منزل کے تعین میں جدید سے قدیم کی جانب مراجعت کا عمل شعوری تھا، جس کے درمیان یوپی کے قریب تمام اہم اضلاع و خطے آگئے، اعظم گڑھ کے پڑاؤ کے عرصہ میں اس کارواں کا گزر دار المصنفین کی وادی خاموش سے بھی ہوا، جس کے متعلق پُر خلوص جذبات اس کتاب میں بھی رقم کئے گئے ہیں، البتہ مدیر معارف کے متعلق یہ لکھنا کہ جب وہ بمبئی میں ٹیچر تھے سہو بیّن ہے۔ یہ سفرنامہ یوپی کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کے علاوہ ان کی تہذیبی و تمدنی اور معاشرتی زندگی کا آئینہ بھی ہے، دیباچہ جناب سید حامد کے قلم سے ہے اور خوب ہے۔

گنج معانی از جناب تلوک چند محروم، متوسط تقطیع، کاغذ مناسب اور کتابت وطباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۵۹۶، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰۲۔

جناب تلوک چند محروم کا یہ مشہور مجموعہ کلام پہلی بار لاہور سے ۱۹۳۲ء میں شایع ہوا تھا اب اس کا تیسرا اور جدید اڈیشن ان کے لائق اور قابل فخر فرزند جناب جگن ناتھ آزاد کی نگرانی میں شایع ہوا ہے، کلام محروم کا امتیاز اصحاب نظر کی نظر میں لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم قرار پایا تھا، اب بھی اس کے حسن میں خداداد لطف سخن اور موزونی طبع کی وہی تابانی و تاثیر ہے، طبع اول نایاب ہوچکا اس لیے اچھا ہوا کہ طبع نو کے لئے اسی نایاب ایڈیشن کو منتخب کیا گیا ہے تاکہ کلام محروم پر داد تحقیق دینے والے پہلے اڈیشن کے مندرجات سے محروم نہ رہ سکیں، دہلی کی محروم میموریل سوسائٹی اس کی اشاعت کے لیے لائق مبارک باد ہے۔

آئینہ سیما از جناب ڈاکٹر شرف الدین ساحل، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت وطباعت مجلد، صفحات ۱۶۰، قیمت ۵۰ روپے، پتہ: صالحہ بک ٹریڈرس نزد جامع مسجد، مومن پورہ، ناگپور۔

جناب شرف الدین ساحل، غالب و مومن کے علاوہ سرزمین برار کے متعلق متعدد مفید اور قابل قدر کتابوں کے مصنف ہیں، وہ اچھے شاعر بھی ہیں، دست کوہکن، شرار جستہ اور حرا کی روشنی ان کے خوبصورت شعری مجموعے ہیں، زیر نظر مجموعہ کلام ان کی پختہ شاعری و سخنوری کا ایک اور نمونہ ہے جس میں ذاتی تجربات و مشاہدات کے درد کے ساتھ عصری تبدیلیوں اور صالح قدروں کے زوال کا کرب بھی ہے، مادہ پرستی کے فروغ اور روحانیت کے فقدان پر ان کے احساسات میں بڑا اثر ہے، بڑی بات یہ ہے کہ مذہبی تعلیمات پر ان کا عقیدہ مستحکم ہے اسی میں وہ انسانیت کی چارہ گری اور کامیابی دیکھتے ہیں۔ یقیناً ان کی شاعری کو اسی سے شرف حاصل ہے۔

ع۔ص۔